عبداللہ بن سبا

(یہودی-یمنی)

حقیقت اور افسانے کے درمیان

تحقیق: ڈاکٹر سامی عطا حسن

جامعہ آل البیت — المفرق

مملکتِ اُردن ہاشمیہ

ترجمہ: ابو مصعب اثری

مسلم ورلڈ ڈیٹا پروسیسنگ پاکستان

خلاصہ

اس تحقیق کا بنیادی مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ عبد اللہ بن سبأ ایک حقیقی تاریخی شخصیت تھا۔اس مقصد کے لیے ابتدائی اسلامی مصادر میں مذکور روایات کا تجزیہ کیا گیا ہے، نیز ان شبہات کا علمی جائزہ لیا گیا ہے جو بعض معاصر محققین نے عبد اللہ بن سبا اور اس کے پیروکاروں، یعنی سبئیہ، کے وجود کے انکار میں پیش کیے ہیں۔

محقق اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ کتبِ فرق اور کتبِ ادب میں عبد اللہ بن سبأ کے بارے میں مذکور روایات صحیح ہیں، اور یہ کہ ابن السوداء، یعنی عبد اللہ بن سبا، جس نے اپنے افکار کی اشاعت کی، اپنے داعیوں کو مختلف اسلامی شہروں میں پھیلا دیا، یہاں تک کہ اس نے خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف رعایا کو بد ظن اور مشتعل کر دیا، جس کے نتیجے میں وہ آپ رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئی اور بالآخر آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا،ایک حقیقی اور ثابت شدہ تاریخی شخصیت تھا۔ نیز فجرِ اسلام میں رونما ہونے والے فتنے کے اسباب پیدا کرنے اور اس کے واقعات کو منظم انداز میں آگے بڑھانے میں اس سے منسوب کردار ایک نمایاں اور واضح تاریخی حقیقت ہے۔

آخر میں تحقیق نے یہ واضح کیا ہے کہ بعض معاصر اہلِ تحقیق کی جانب سے عبد اللہ بن سبأ کے وجود کے بارے میں اٹھائے گئے شبہات علمی دلائل سے محروم ہیں، اور نہ ہی انہیں ابتدائی اور عہدِ واقعات سے قریب اسلامی مصادر کی تائید و حمایت حاصل ہے۔

مقدمہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملنے، پھر ارتداد کی جنگوں کے برپا ہونے، اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ان فتنوں کا کامیابی سے قلع قمع کر دینے کے بعد اسلامی معاشرے میں کچھ ایسی شخصیات داخل ہوئیں جن کے دل ابھی تک نورِ نبوت سے منور نہ ہوئے تھے اور نہ ہی انہیں یقین وایمان کے سائے میں اسلامی تربیت کا مکمل موقع ملا تھا۔ ان کا اسلام میں داخل ہونا درحقیقت اسلام کی مخالفت کرنے اور اندر ہی اندر اس پر کاری ضرب لگانے کے لیے تھا۔

چنانچہ یہ لوگ بتدریج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابۂ کرام کے شانہ بشانہ آ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ انہیں ان کے شایانِ شان مقام و مرتبہ سے پیچھے دھکیل دیا، اور امت کی اجتماعی زندگی کے بہت سے اہم شعبوں پر اپنا اثر و نفوذ قائم کر لیا۔

یہ عناصر نہ صرف امت کے بہت سے معاملات میں فیصلہ کن اثر و رسوخ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے بلکہ اسلام قبول کرنے میں سبقت رکھنے

والے اہلِ ایمان کو پس منظر میں دھکیل کر خود آگے بڑھ بیٹھے۔ انہی دراندازشخصیات نے ان فرقوں اور مذاہب کے ظہور میں بنیادی کردار ادا کیا جنہوں نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا، ان کی اجتماعیت کو منتشر کر دیا، اور قرآنِ کریم کو اپنے درمیان ٹکڑوں میں تقسیم کر ڈالا۔ ہر فرقہ گمراہ تاویلات کا ہتھیار ہاتھ میں لیے قرآن سے اپنے نظریات کے حق میں استدلال کرنے لگا اور اسے اپنے مذہب کی تائید اور اپنے دعووں کی دلیل بنانے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ لوگ بظاہر اہلِ بیتِ نبوت سے محبت کا دم بھرتے تھے، لیکن حقیقت میں وہ ہر وہ تدبیر اختیار کرتے رہے جو ان کی شان کو مجروح کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ چنانچہ اہلِ بیت کو انہی اسلام دشمن عناصر کے ہاتھوں ظلم و ستم اور جبر و استبداد کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ وہ اس پاکیزہ اور معزز خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس کی پرورش نبوت کے گھرانے میں ہوئی تھی اور جس نے اسلام کو اس کے خالص سرچشموں سے حاصل کیا تھا۔ اسی بنا پر اہلِ بیت ان معاند عناصر کے اولین اہداف بن گئے، جنہوں نے اسلام سے دشمنی کو منافقانہ مکر و فریب کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔

پھر جب سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی پہلی چنگاری نمودار ہوئی تو یہی عناصر فوراً سر گرم ہو گئے، قیادت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے لپکے، اور لوگوں کو اندھی فتنہ انگیزی کی لاٹھی سے ہانکتے ہوئے انتشار اور بغاوت کی راہ پر ڈالنے لگے۔

اور جب کبھی لوگوں کے جوش و خروش میں کمی آتی تو یہ عناصر اپنی مکاری، عیاری اور فریب کاری کے کانٹے سے انہیں پھر ابھار دیتے۔

ان معاند عناصر کا سرغنہ عبد اللہ بن سبا تھا، جو ابن السوداء کے لقب سے معروف تھا۔ وہ یمن کا ایک یہودی تھا جو حجاز آیا اور ایسے مقاصد کی خاطر ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا جنہیں وہ چھپائے ہوئے تھا، لیکن اس کی گمراہ کن دعوت نے بالآخر ان پردہ پوش عزائم کو آشکار کر دیا۔ چنانچہ اس کے بارے میں کہا گیا ہے:

وہ اپنے ذہن میں جزیرۂ عرب سے یہودیوں کی جلاوطنی کی تلخی کو سمیٹے ہوئے مدینہ آیا۔ اپنے دل کے تمام اضطراب اور کینہ و بغض کے ساتھ اس نے بظاہر

اسلام قبول کیا، جبکہ اس کا پختہ ارادہ یہ تھا کہ اس نوخیز اسلامی معاشرے کو فتنہ و فساد اور شکوک و شبہات کے بے کراں سمندروں میں غرق کر دے[1]۔

[1]الشابي، علي، 1971م، النشرة العلمية لجامعة الزيتونة، كلية الشريعة وأصول الدين، أثر التراث الشرقي في المذهب السبئية، ص 245-ع1، السنة الأولى، ص 245.

ابن سبا کا نسب اور وطن

مقالات و فرق کی کتب، نیز تاریخ اور ادب کی اکثر وہ کتابیں جن میں خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد میں رونما ہونے والے فتنے اور بعد ازاں کوفہ میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس بات پر متفق ہیں کہ عبد اللہ بن سبا ایک یہودی شخصیت تھا، جو مسلمانوں کے معاشرے میں ایسے عقائد وافکار لے کر ظاہر ہوا جن کا مقصد مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنے میں مبتلا کرنا تھا۔

بعد ازاں مختلف قبائل کے اوباش اور سطحی سوچ رکھنے والے افراد، نیز ذاتی رنجشوں اور انتقامی جذبات سے مغلوب بعض عناصر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ان لوگوں کی مدد سے وہ مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ ڈالنے، ان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اور اسلامی فتوحات کے تسلسل کو روکنے میں کامیاب ہوا، جس کے بعد اہلِ بیت سے متعلق باہمی جنگوں کا آغاز ہوا۔ البتہ اس کی زندگی اور سرگرمیوں کی تفصیلات بیان کرنے میں ان مصادر کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔

اہلِ سنت اور شیعہ دونوں کے مصادر اس بات پر متفق ہیں کہ عبد اللہ بن سبأ یمن کے شہر صنعاء کا ایک یہودی تھا، جس نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے، ان کے درمیان فتنہ برپا کرنے، اور تفرقہ و اختلاف کے اسباب پیدا کرنے کی غرض سے ظاہری طور پر اسلام قبول کیا تھا۔

الف) امام طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

عبداللہ بن سبأ صنعاء کا ایک یہودی تھا[2]۔

ب) امام ابن عساکر نے لکھا ہے:

"عبداللہ بن سبأ، جس کی طرف سبئیہ کی نسبت کی جاتی ہے اور جو غالی رافضیوں میں سے تھا، اس کا اصل وطن یمن تھا[3]۔

---

[2] الطبري، أبو جعفر محمّد، تاريخ الرسل والملوك، تحقيق عبد السلام هارون، 1950م, ج4، ط2، القاهرة، ص283، وانظر أبو الشعر، هند، 1983م، حركة المختار بن أبي عبيد الثقفي في الكوفة، ص329.

[3] ابن عساكر، أبو القاسم علي بن الحسن بن هبة الله الشافعي، (ت 571هـ) مختصر تاريخ دمشق، ج12، بيروت ص 219.

ج) الناشئ الاکبر نے لکھا ہے:

عبداللہ بن سبا صنعاء کا رہنے والا تھا۔ اس نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، پھر مدائن میں سکونت اختیار کر لی[4]۔

د) سعد بن عبداللہ القمی الاشعری نے لکھا ہے:

اہلِ علم کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا، پھر اس نے اسلام قبول کیا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے وابستگی اختیار کر لی[5]۔

ھ) جرمن مستشرق اسرائیل فریدلینڈر نے ''عبداللہ بن سبا اور اس کی یہودی اصل'' کے عنوان سے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں عبداللہ بن سبا کے

ابن عساكر، أبو القاسم علي بن الحسن بن هبة الله الشافعي، (ت 571هـ) مختصر تاريخ دمشق، ج12، بيروت ص 219.

[4] الناشئ الأكبر، مسائل الإمامة ومقتطفات من الكتاب الأوسط للمقالات، تحقيق يوسف فان، 1971م، بيروت، ص22-23.

[5] القمي، أبو خلف سعد بن عبد الله الاشعري، المقالات والفرق، تحقيق مُحمَّد جواد مشكور، 1963م، طهران، ص 20-21.

یہودی ہونے اور اس کے یمنی النسل ہونے کے حق میں متعدد دلائل پیش کیے ہیں[6]۔

و) احمد امین لکھتے ہیں:

ابن السوداء یہ شخص سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس آیا[7]، مگر ان دونوں نے اس کی بات قبول نہ کی۔ پھر سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ[8] اسے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ[9] کے پاس لے

---

[6] بدوي، عبد الرحمن، مذاهب الإسلاميين، ج2، دار العلم للملايين، بيروت، ص 219.

[7] أبو الدرداء، عويمر أو عامر، واسم أبيه ثعلبة أو عبد الله، اسلم يوم بدر، ولاه معاوية قضاء دمشق توفي سنة 32هـ، ابن حجر احمد بن علي العسقلاني، الإصابة في تمييز الصحابة، نشردار التراث العربي،ط1، 1328 هـ،ج4، بيروت، ص 28.

[8] عبادة بن الصامت كان من النقباء، شهد بدراً و المشاهد كلها مع رسول الله – ﷺ – أرسله عمر بن الخطاب – رضي الله عنه – إلى فلسطين ليعلم أهلها القرآن ويفقههم في الدين، توفي سنة 34 هـ، وقيل عاش إلى سنة 45 هـ، الإصابة ج4،ص 28.

[9] معاوية بن أبي سفيان، اسلم بعد الحديبية، وكتم إسلامه حتى أظهره عام الفتح، وكان في القضاء مسلما، أورده ضمن كتاب النبي – ﷺ – كثير من المؤرخين كالطبري في تاريخ الأمم والملوك– تحقيق مُحَمَّد أبو الفضل إبراهيم ج6،ص179، واليعقوبي احمد بن أبي يعقوب بن جعفر، ط دار صادر بيروت،ج2، ص 81 وغيرهما.

گئے اور فرمایا: اللہ کی قسم! یہی وہ شخص ہے جس نے تمہارے خلاف ابوذر[10] کو بھڑکایا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ابن السوداء اسی عبداللہ بن سبائ کا لقب تھا، اور وہ صنعاء کا ایک یہودی تھا[11]۔

ز) ڈاکٹر صالح دراد کہ لکھتے ہیں:

فتنے سے متعلق روایات ہمیں صرف سیف بن عمر تمیمی کے طریق سے نہیں پہنچی ہیں، بلکہ دیگر طرق سے بھی منقول ہیں۔ مجموعی طور پر یہ تمام روایات سیف کی روایت کے خلاف نہیں، بلکہ اس کی صحت کی تائید کرتی ہیں اور اس میں بعض مزید تفصیلات کا اضافہ بھی کرتی ہیں۔ اگر مؤرخین نے سیف کی روایت کو اختیار کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس میں اس پوشیدہ ہاتھ کی نشاندہی دیکھی جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف منظم ہونے والی مخالفت کے پس پردہ سرگرم تھا۔

---

[10] أبو ذر، جندب بن جنادة الغفاري، كان رابع أربعة سبقوا إلى الإسلام، توفي بالربذة – عام 32 هـ، طبقات ابن سعد، ج 4، ص 161-171 .

[11] أمين، أحمد، 1969م، فجر الإسلام، دار الكتاب اللبناني، ط1، ص 136.

پھر آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

اس بنا پر قدیم مؤرخینِ ملل و نحل کی بیان کردہ روایات میں سبئیہ کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ سبئیہ کے وجود کی حقیقت جتنی واضح ہے، اتنی ہی ایک دوسری حقیقت بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ اگر داخلی سطح پر پہلے سے مخالفت موجود نہ ہوتی تو عبد اللہ بن سبا اپنے مقاصد میں ہر گز کامیاب نہ ہو سکتا تھا[12]۔

مذکورہ بالا تمام روایات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ عبد اللہ بن سبا صنعاء کا ایک یہودی تھا۔ اس زمانے میں، جب صنعاء حبشیوں کے قبضے میں تھا، وہ یہودیوں کا ایک اہم مرکز شمار ہوتا تھا، اور بظاہر یہودی وہاں حبشیوں کے یمن پر حملہ کرنے سے بھی پہلے سے آباد تھے[13]۔

---

[12] درادكة، صالح موسى، 1992م، العلاقات العربية اليهودية حتى نهاية عهد الخلفاء الراشدين، ط1، عمان، ص 203-411.

[13] مجلة الرسالة المصرية، عدد 775، ص 525

عبد اللہ بن سبا کے یہودی ہونے کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابن حزم اندلسی نے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

غالی فرقوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا ہے، اوران میں سب سے پہلے عبد اللہ بن سبا حِمیری کے پیروکار تھے[14]۔

امام ابن حزم نے عبد اللہ بن سبا کی نسبت قبیلۂ حِمیر کی طرف کی ہے، اور قبیلۂ حِمیر صنعاء میں آباد تھا۔

کتاب «قرة العیون بأخبار الیمن المیمون» کے محقق لکھتے ہیں:

"صنعاء بیشتر اسلامی ادوار میں یمن کا دارالحکومت رہا ہے اور قدیم ترین عرب شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد طوفانِ نوح کے بعد رکھی گئی تھی۔ یہ جزیرۂ عرب کی دلہن، اس کا درخشاں تاج، اور مملکتِ حِمیر کا مرکز تھا۔ اسی قبیلۂ حِمیر کی طرف کعب بن ماتع الرعینی الحمیری کی نسبت ہے، جو

---

[14] ابن حزم، أبو محمّد علي بن احمد بن حزم، –الفصل في الملل و الأهواء والنحل، تحقيق محمّد إبراهيم نصر وزميله، ج4،ص186

کعب الاحبار کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ اہلِ کتاب کے جلیل القدر عالم اور ان کے بڑے احبار میں سے تھے[15]۔

ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ: 'یہودیت کا چلن (یمن کے قبائل) حمیر، بنی کنانہ، بنی الحارث بن کعب اور کندہ میں تھا[16]۔

اور جن مراجع و مصادر تک میری رسائی ہو سکی ہے، ان میں عبد اللہ بن سبا کے والد کے نام کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔۔ سوائے تاج العروس کے مصنف زبیدی کے، جنہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ (فروہ بن مسیک المرادی) کی حدیث میں جس ''سبا'' کا ذکر آیا ہے، وہ دراصل غالیوں کے فرقے سبئیہ کے بانی، عبد اللہ بن سبا کا والد ہے[17]۔ تاہم، یہ رائے حقیقت اور صحت سے کوسوں دور معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا والد خالص حمیری نسل سے ہو، یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ولاء (موالات و وفاداری) کے تعلق کی بناپر اس قبیلے

---

[15] ابن الديبع، وجيه الدين عبدالرحمن بن علي الشيباني، قرة العيون بأخبار اليمن الميمون، تحقيق مُحَمَّد بن علي الأكوع-المكتبة السلفية في القاهرة، ص39.

[16] ابن قتيبة الدينوري، أبو مُحَمَّد عبد الله، المعارف، دار الكتب العلمية، بيروت، ص339.

[17] الزبيدي، مُحَمَّد مرتضى، تاج العروس، المطبعة الخيرية، ج1، ص75-76.

سے منسوب ہوا ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ان ابناء (یمن میں مقیم فارسی نسل) میں سے ہو[18] جن کے باپ کا اتہ پتہ نہیں تھا۔ جہاں تک اس کی ماں کا تعلق ہے، تو وہ حبشی نسل سے تھی[19]، اور اسی وجہ سے اسے ''ابن السودا'' (سیاہ فام عورت کا بیٹا) کا لقب ملا۔

---

[18] الأبناء: هم أبناء فارس الذين أرسلهم كسرى لنجدة سيف بن ذي يزن الحميري، وقد اختلفوا في سبب تسميتهم بالأبناء على أقوال أوجهها أن كسرى لما جهز الجيش المذكور، قال له المزاربة: امده بمن في سجونك، فان ظفروا فأبناءك، فان قتلوا فأعداءك، فأمده بهم وو صبحهم له. وقيل: سموا بالأبناء لأنهم يقال لهم هؤلاء أبناء سيف، وقيل غير ذلك.

یہ اہلِ فارس ایران کی وہ اولاد ہیں جنہیں کسریٰ (شاہِ فارس) نے سیف بن ذی یزن حمیری کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ ان کا نام الابناء پڑنے کی وجہ میں مختلف اقوال ہیں، جن میں سے سب سے زیادہ جاندار اور قوی قول یہ ہے کہ جب کسریٰ نے مذکورہ لشکر تیار کیا، تو درباری وزراء (مرازبہ) نے اس سے کہا: ان کی مدد ان لوگوں سے کیجیے جو آپ کی جیلوں میں بند ہیں؛ اگر وہ غالب آ گئے تو وہ آپ کے فرزند (وفادار بیٹے) ٹھہریں گے، اور اگر وہ مارے گئے تو وہ آپ کے دشمن ہی تھے (جن سے چھٹکارا مل گیا)۔ چنانچہ کسریٰ نے ان قیدیوں کے ذریعے اس کی مدد فرمائی اور انہیں اس کے سپرد کر دیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہیں الابناء اس لیے کہا گیا کیونکہ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ سیف کے بیٹے ہیں، اور اس کے علاوہ بھی اقوال کہے گئے ہیں۔

[19] تحدث لبن حبيب عن ابن سبأ واعتبره أحد أبناء الحبشيات. ابن حبيب: أبو جعفر مُحَمَّد بن حبيب بن أميه، المحبر، تحقيق ايلزا ليختن، دار الأفاق، بيروت، ص308.

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ حبشیوں اور یمنیوں کے باہمی اختلاط اور شادی بیاہ کے نتیجے میں یمن میں ایک دوغلی اور مخلوط نسل نے جنم لیا تھا، اور بعید نہیں کہ ابن سبا بھی اسی نسل کا ایک فرد رہا ہو۔ اسی مخلوط نسل کی طرف کمیت نے نزار کے مقابلے میں یمنیوں پر مفاخرت کرتے ہوئے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے کہ:

ہمارے لیے ہی آسمان کا چاند ہے اور ہر وہ ستارہ ہے، جس کی طرف ہدایت اور راستہ پانے والوں کے ہاتھ اشارہ کرتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ جب اللہ نے "نزار" کا نام بلند کیا، تو اسے مکہ کے مکینوں میں آباد فرما دیا۔

اس (اللہ) نے تمام تر مکارم اور اخلاقی عظمتوں کو خالصتاً ہمارے لیے مخصوص کر دیا؛ پس باقی لوگوں کے حصے میں (ذلت کی) گدی آئی اور ہمارے حصے میں (عزت و سرفرازی کی) پیشانی آئی۔

اور نزار کی بیٹیوں نے کبھی بھی کسی سیاہ فام (حبشی) یا سرخ فام (رومی/ فارسی) کو اپنا شوہر (اور کفو) نہیں پایا[20]۔

اور اس ''سبا'' سے مراد جس کی طرف عبد اللہ بن سبا منسوب کیا جاتا ہے، خود ملکِ یمن ہے؛ چنانچہ ہر یمنی باشندے کے بارے میں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ وہ ''ابن سبا''(سبا کا بیٹا) ہے، بالکل اسی طرح جیسے کسی مصری کو ''ابن النیل''(نیل کا بیٹا) کہہ دیا جاتا ہے، اور اسی پر دیگر مثالوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔۔۔اور اہل یمن کی سبا کی طرف یہ نسبت ایک اور روایت سے مزید مستحکم ہو جاتی ہے جسے یعقوب بن شیبہ نے اپنی کتاب (مسند امیر المؤمنین عمر بن الخطاب) میں نقل کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ :''وہ اہل یمن میں سے (قبیلہ یا ملک) سبا سے تعلق رکھتے تھے[21]۔

بیشک قرآن کریم نے سورہ النمل میں اس واقعے کی حکایت بیان فرمائی ہے جو ہدہد نے ہمارے سردار حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے یوں پیش کیا تھا: ''پھر وہ (ہدہد) زیادہ دیر نہ رکا، (اور حاضر ہو کر) کہنے لگا: میں ایک ایسی بات

---

[20] الشابي، علي، مباحث في علم الكلام والفلسفة، دار أبو سلامه، تونس، ص20.

[21] جواد، سامي، مسند عمر بن الخطاب، بيروت،ص68.

معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کے علم میں نہیں ہے، اور میں آپ کے پاس (ملکِ)سبا سے ایک یقینی اور سچی خبر لے کر آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک ایسی عورت کو دیکھا ہے جو ان پر حکومت کرتی ہے، اسے ہر طرح کا ساز و سامان دیا گیا ہے اور اس کا ایک عظیم الشان تخت ہے[22]۔

قرآن کریم میں ایک پوری سورت موجود ہے جسے ''سورہ سبا'' کا نام دیا گیا ہے، اور قرآن نے ہمیں اس فراخ رزق اور دائمی نعمتوں کے احوال سے باخبر کیا ہے جن میں وہ (اہلِ سبا) زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہوں نے اس بند (ڈیم) کے پیچھے، جو ''سدِ مأرب'' کے نام سے معروف ہوا، وافر مقدار میں پانی ذخیرہ کر رکھا تھا۔ لیکن جب انہوں نے حقیقی منعم (نعمتیں عطا کرنے والے اللہ) کا شکر ادا کرنے، عملِ صالح بجالانے اور پسندیدہ طور طریقہ اختیار کرنے سے اعراض کیا، تو اللہ نے ان سے اس خوشحالی کا سبب ہی چھین لیا جس میں وہ مگن تھے۔ اور ان پر ایک ایسا تند و تیز اور جڑ سے اکھاڑ دینے والا سیلاب (سیلِ عرم) بھیج دیا جو اپنے راستے میں ''عرم''، یعنی بھاری پتھر بہا لایا؛ چنانچہ وہ بند ٹوٹ گیا اور پانی چاروں طرف پھیل گیا، پس اس نے سرکشی اختیار کی اور زمین کو غرقاب کر

---

[22] سورة النمل، الآية: 22.

دیا۔ اور ان کے وہ وسیع و شاداب اور مہکتے ہوئے باغات، ایک ایسے چٹیل ریگستان میں تبدیل ہو گئے جہاں خودرو اور جھاڑ دار جنگلی درخت یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے ان کے ان دو باغات کے بدل میں انہیں دو ایسے باغات دے دیے جو بدمزہ (کڑوے کاسنی) پھلوں، جھاؤ کے درختوں اور کچھ تھوڑے سے بیری کے درختوں پر مشتمل تھے۔ یہ بدلہ ہم نے انہیں ان کی ناشکری کی وجہ سے دیا، اور ہم ایسا بدلہ صرف ناشکروں ہی کو دیتے ہیں[23]۔

یہ بات بھی ممکن (اور قرینِ قیاس) ہے کہ ابن سبا نے اپنے یہودی باپ کا نام ہم سے جان بوجھ کر چھپایا ہو، تاکہ لوگ اس کی اصل حقیقت سے واقف نہ ہو سکیں۔ رہا معاملہ اس رائے کا جس کی طرف بغدادی گئے ہیں کہ ابن سبا بنیادی طور پر اہل حیرہ (عراق) میں سے تھا، جہاں انہوں نے لکھا ہے کہ: ابن السوداء — یعنی ابن سبا — اصل میں حیرہ کا رہنے والا ایک یہودی تھا[24]۔ اور اسی (حیرہ والی) رائے میں امامِ فاضل (محمد ابو زہرہ) نے بھی اپنی کتاب

---

[23] سورة سبأ، الآيتان 15،16.

[24] البغدادي، عبد القاهر، الفرق بين الفرق وبيان الفرقة الناجية منهم، تحقيق مُحَمَّد محي الدين عبدالحميد، طبع المدني، القاهرة، ص238.

المذاہب الاِسلامیۃ میں ان کی اتباع و پیروی کی ہے[25]۔تو یہ بات ان روایات کے متصادم اور معارض نہیں ہے جو یہ کہتی ہیں کہ وہ اصلاً یمنی تھا؛ کیونکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اصالتاً یمنی ہو اور پھر ہجرت کرکے عراق کے شہر حیرہ چلا گیا ہو، یہ جانتے ہوئے کہ حیرہ تمام یہودیوں، دیگر مذاہب کے پیروکاروں اور مختلف نظریات کا مرکز تھا۔اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ مسلمانوں نے جب کوفہ کی شہر سازی اور منصوبہ بندی کی، تو ابتدائی مرحلے میں یہودی وہاں منتقل نہیں ہوئے، بلکہ وہ حیرہ ہی میں مقیم رہے۔اور (اسی تاریخی پس منظر میں) حجاج بن یوسف ثقفی نے (سنہ ۷۷ ہجری میں) کوفہ کے منبر پر کھڑے ہو کر کہا تھا: ”اے اہل کوفہ ! اللہ اسے عزت نہ دے جو تمہارے ذریعے عزت کا طالب ہو، اور نہ اس کی مدد کرے جو تمہارے ذریعے نصرت کا خواہاں ہو۔ ہمارے پاس سے نکل جاؤ، ہمارے ساتھ ہمارے دشمن کے خلاف جنگ میں شریک نہ ہو، اور حیرہ میں جا کر یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ رہو[26]۔اس کے بعد جب ابن سبا مدینہ منورہ آیا، اور وہاں (مدینہ منورہ میں) رائج مذہبی اور سماجی زندگی کو قریب سے دیکھا اور اس کا حصہ بنا، تو اس نے وہاں ایک مخصوص

---

[25] أبو زهره، محمّد، تاريخ المذاهب الإسلامية، دار الفكر العربي، القاهرة، ص64.

[26] ي.س.غنيمة، نزهة المشتاق في تاريخ يهود العراق، ط بغداد، ص60.

موقف اختیار کرلیا جو خلیفہ اور ان کے قرابت داروں کے خلاف بغض و عناد پر مبنی تھا۔ یہ موقف ابن سبا کے اس باطل زعم کی وجہ سے تھا کہ خلیفہ نے اپنے رشتہ داروں کو مال اور اقتدار کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے یہاں وہاں اپنے حامیوں کو پھیلانا شروع کر دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے سامنے — جھوٹ اور بہتان کے طور پر — عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کی خامیاں اور برائیاں آشکار کریں اور لوگوں کو بغاوت پر اکسائیں۔ فارسی مؤرخ ''میر خواند'' کا بیان ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ابن سبا کے کینے اور حقد کا اصل سبب یہ تھا کہ: وہ جب مدینہ آیا تھا تو اسے یہ امید تھی کہ خلیفہ اس کی آؤ بھگت اور تکریم کریں گے۔ لیکن جب اسے اپنی مراد حاصل نہ ہوئی، تو اس نے خلیفہ سے ناراض اور نالاں لوگوں سے رابطے استوار کرنا شروع کر دیے اور کھلم کھلا عثمان رضی اللہ عنہ کے انتظامی امور پر اعتراضات داغنے لگا۔ بالاخر عثمان رضی اللہ عنہ تک اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے فرمایا: یہ کون یہودی ہے جس کی یہ باتیں میں برداشت کر رہا ہوں؟ چنانچہ انہوں نے اسے مدینہ سے جلاوطن کرنے کا حکم دے دیا۔ پھر وہ آخر کار مصر چلا گیا اور وہاں عثمان

رضی اللہ عنہ کے خلاف سرگرم فتنہ پروروں اور سازشیوں میں شامل ہو گیا[27]۔

[27] الشابي، علي، مباحث في علم الكلام والفلسفة، مرجع سابق، ص20.

عبداللہ بن سبا کے وجود کا انکار کرنے والوں کے شبہات اور ان کا ابطال ورد (تفنید)

معاصر (دورِ حاضر کے) مصنفین اور اہل قلم کے ایک گروہ نے عبداللہ بن سبا کے وجود کا سرے سے انکار کرنے کی کوشش کی ہے،اور اس معاملے میں انہوں نے مختلف راہیں اختیار کی ہیں۔ان میں سے بعض تو وہ ہیں جنہوں نے اس کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کیا، جبکہ بعض کا کہنا یہ ہے کہ :اگر ہم بحث اور فرضی طور پر (جدلاً)اس کے وجود کو تسلیم کر بھی لیں،تب بھی ہم اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ نوخیز اسلامی ریاست کے ابتدائی دور میں رونما ہونے والے فتنوں میں اس کا اس قدر (بڑا)اثر ورسوخ رہا ہو۔ چنانچہ ہم ان تمام شکوک و شبہات اور اوہام کو یہاں پیش کریں گے تاکہ ان کی حقیقت اور زائف و باطل ہونا واضح کیا جاسکے۔

اولاً: مرتضیٰ عسکری کے شکوک وشبہات:

نجف اشرف میں کلیۃ علوم الدین کے ڈیڈ (عمید) مرتضیٰ عسکری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن مؤرخین نے بھی عبداللہ بن سبا کے احوال پر گفتگو کی ہے، ان کے اکثریتی طبقے نے اپنی معلومات امام طبری سے اخذ کی ہیں، اور یہ کہ طبری نے اس سلسلے میں مشہور اخباری وراوی سیف بن عمر[28] کی روایات پر تکیہ کیا ہے، جنہیں علمائے جرح و تعدیل نے مجروح (ناقابلِ اعتبار) قرار دیا ہے۔ مرتضیٰ عسکری کا بیان ہے کہ: چنانچہ جب ہم سیف کی شخصیت پر تحقیق کے لیے کتبِ رجال کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ رجالی ائمہ اسے ان الفاظ میں موصوف کرتے ہیں کہ: وہ مجہول راویوں کی ایک بہت بڑی جماعت سے روایت کرتا ہے، وہ حدیث میں ضعیف ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں (لیس بشیء)، وہ متروک الحدیث ہے، حدیثیں گھڑتا (وضع کرتا) تھا، روایت کے باب میں وہ ساقط الاعتبار ہے، وہ ثقہ راویوں کی طرف منسوب کر کے من گھڑت (موضوع) روایات نقل کرتا ہے، اس کی عام

---

[28] سيف بن عمر الضبي التميمي الكوفي- مؤلف كتاب (الفتوح والردة) وكتاب(الجمل وسير عائشة وعلي) توفي سنة 170هـ، ابن النديم، الفهرست،ص137

احادیث منکر ہیں، اور وہ وضعِ حدیث اور زندقہ (ملحدانہ الحاد) کے الزام سے متہم ہے[29]۔

ہم (اس کے جواب میں) یہ کہتے ہیں کہ: بیشک علمائے جرح وتعدیل نے اسے مجروح قرار دیا ہے؛ چنانچہ اس کے بارے میں (امام) نسائی نے فرمایا ہے: سیف بن عمر الضبی ضعیف ہے[30]۔ ابو حاتم رازی نے اس کے متعلق کہا ہے: ہم سے عبدالرحمن نے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ میرے والد سے سیف بن عمر الضبی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: وہ متروک الحدیث ہے، اور اس کی حدیثیں (روایت کے اسلوب میں) واقدی کی حدیثوں سے مشابہت رکھتی ہیں، ابن معین نے اس کے بارے میں فرمایا ہے: سیف حدیث کا ضعیف ہے[31]۔ امام ذہبی نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف اسی

---

[29] العسكري، مرتضى، 1972م،عبد الله بن سبأ وأساطير أخرى، دار الغدير، بيروت، ص17.

[30] ابن حبان، محمد البستي ، المجرحين من المحدثين والضعفاء والمتركين، تحقيق محمود إبراهيم زايد، حلب،ص14.

[31] ابن أبي حاتم الرازي، عبدالرحمن، الجرح والتعديل، مطبعة جمعية دائرة المعارف العثمانية، حيدر أباد الدكن، ط1، ج2،ص378.

قول پر اکتفا کیا ہے کہ :ابن معین اور دیگر ائمہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے[32]۔اور ابن حجر کے نزدیک:''سیف حدیث میں ضعیف ہے[33]۔ لیکن(یہ نکتہ ملحوظِ خاطر رہے کہ)احادیثِ نبویہ شریفہ کے باب میں اس کی مرویات پر جو طعن اور جرح کی گئی ہے، وہ لازمی طور پر ان تاریخی اخبار و واقعات پر لاگو نہیں ہوتی جنہیں وہ روایت کرتا ہے؛ کیونکہ احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم شریعت کا وہ حصہ ہیں جن پر احکام کی بنیاد رکھی جاتی ہے، جن سے حلال و حرام اخذ کیا جاتا ہے، اور جن کے ذریعے حدود نافذ کی جاتی ہیں؛ پس احادیث کا تعلق تشریعِ اسلامی کے ایک ایسے بنیادی اصل سے ہے جو کہ سنّتِ نبویہ غراء(روشن سنت)ہے۔

تاریخی اخبار(واقعات)کی روایت کا معاملہ (احادیث سے)مختلف ہے؛ کیونکہ یہ تاریخی اخبار اگرچہ اہم تو ہیں، لیکن ان کی اہمیت احادیثِ نبویہ کے مرتبے

---

[32] الذهبي ،محمد بن احمد بن عثمان، الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة، تحقيق عزت علي عيد عطيه وزميله، 1972م، نشر دار الكتب الحديثة، القاهرة، ج1،ص416.

[33] ابن حجر العسقلاني، احمد بن علي، تقريب التهذيب، تحقيق عبد الوهاب عبد اللطيف،1975م،ط2،نشر دار المعرفة،بيروت،ج1،ص344.

تک نہیں پہنچتی،اور نہ ہی ان سے کوئی ایسے شرعی احکام صادر ہوتے ہیں جن کی پابندی لازم ہو؛ کیونکہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ) ہر انسان کی بات قبول بھی کی جاسکتی ہے اور چھوڑی بھی جاسکتی ہے، سوائے اس قول کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو۔ اور آیئے ہم دوبارہ جرح وتعدیل کی ان کتابوں کی طرف رجوع کریں جنھوں نے سیف کو بطورِ محدث تو مجروح قرار دیا ہے، تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ بطورِ مؤرخ اور اخباری (تاریخی راوی) ان کا سیف کے بارے میں کیا حکم ہے۔ چنانچہ امام ذہبی نے فرمایا ہے: سیف ایک (ماہر) اخباری اور (تاریخ کا گہرا) علم رکھنے والا تھا[34] ۔حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے: وہ حدیث میں ضعیف ہے (لیکن) تاریخ میں بنیادی ستون اور مستند (عمدہ) ہے[35]، تو پھر ہم کیوں کچھ اقوال کو تو لے لیتے ہیں اور کچھ دوسرے اقوال کو چھوڑ دیتے ہیں؟ اور حقیقت تو یہ ہے کہ عبد اللہ بن سبا کے احوال و اخبار پر تنہا سیف بن عمر ہی وہ واحد مأخذ اور مصدر نہیں ہے جس نے ان روایات کو مخصوص کر رکھا ہو، بلکہ ابن سبا اور اس کے گروہ

---

[34] الذهبي، محمَّد بن احمد بن عثمان، ميزان الاعتدال، تحقيق محمَّد علي البجاوي، 1963م، دار أحياء الكتب العربية، ط1، القاهرة، ج2، ص255.

[35] ابن حجر العسقلاني، احمد بن علي، تقريب التهذيب، مرجع سابق، ج1، ص344.

کے احوال متقدمین (قدیم) علماء اور سیف بن عمر کے علاوہ دیگر ایسے راویوں سے بھی منقول ہو کر وارد ہوئے ہیں جیسے کہ :

الف: یحییٰ بن حمزہ زبیدی کی کتاب (طوق الحمامہ) میں سوید بن غفلہ جعفی کوفی متوفی سن (80ھ/699ء) سے منقول ہے کہ وہ امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: میں کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا ہوں جو ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا برے الفاظ میں تذکرہ کر رہے تھے، اور وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ بھی اپنے دل میں ان دونوں کے لیے ایسے ہی منفی جذبات چھپائے ہوئے ہیں، اور ان برائی کرنے والوں میں عبداللہ بن سبا بھی شامل ہے۔ یہ سن کر علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا اس خبیث اور سیاہ بخت سے کیا لینا دینا! پھر انہوں نے فرمایا: اللہ کی پناہ کہ میں ان دونوں کے لیے اپنے دل میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ اور چھپاؤں۔ اس کے بعد انہوں نے ابن سبا کی طرف پیغام بھیجا اور اسے مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا، اور خود منبر کی طرف بڑھے، یہاں تک کہ جب لوگ جمع ہو گئے تو انہوں نے ان دونوں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خوب مدح و ثنا فرمائی، اور پھر ارشاد فرمایا: اگر مجھے کسی بھی شخص کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ

وہ مجھے ان دونوں پر فضیلت دیتا ہے، تو میں اسے مفتری (جھوٹا تہمتی) کی حد (یعنی اسی کوڑے) لگاؤں گا[36]۔

ب: حافظ ابن عساکر نے زید بن وہب جہنی کوفی متوفی سن (90ھ/709ء) سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا: امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا اس خبیث اور سیاہ بخت — یعنی عبد اللہ بن سبا — سے کیا لینا دینا! وہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی عیب جوئی اور تنقیص کیا کرتا تھا[37]۔

ج۔ امام ابن سعد نے اپنی کتاب الطبقات میں ابراہیم بن یزید نخعی متوفی سن (96ھ/714ء) سے روایت کی ہے کہ ایک شخص ابراہیم نخعی کے پاس آیا کرتا تھا اور ان سے علم سیکھتا تھا۔ اسی دوران اس نے کچھ لوگوں کو علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کے معاملے کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا، تو اس نے اپنے دل میں کہا: کیا میں اس شخص سے علم حاصل کر رہا ہوں؟ جبکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگ علی اور عثمان کے معاملے میں باہم دست و گریبان اور اختلاف کا شکار ہیں؛

---

[36] الهي ظهير، إحسان، السنة والشيعة، نشر إدارة ترجمة السنة- الهور، باكستان- ص 8، نقلا عن طوق الحمامة ليحيى بن حمزة الزبيدي.

[37] ابن عساكر، مختصر تاريخ دمشق، مرجع سابق، م 12، ص 222.

چنانچہ اس نے ابراہیم نخعی سے اس کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا: ”نہ تو میں سبئی (عبد اللہ بن سبا کے نظریات کا حامل) ہوں اور نہ ہی مرجئی (ارجاء کا عقیدہ رکھنے والا) ہوں[38]۔

د۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں شعبی (عامر بن شراحیل حمیری یمنی) متوفی سن (103ھ/721ء) سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا: سب سے پہلے جس شخص نے (اسلام میں عقائد کے باب میں) جھوٹ گھڑا، وہ عبد اللہ بن سبا تھا۔ اور اسی طرح ابن عساکر نے ابن الطفیل (عامر بن واثلہ لیثی) رضی اللہ عنہ، جو کہ آخری رحلت فرمانے والے صحابی ہیں اور ان کی وفات سن (110ھ/728ء) میں ہوئی، سے روایت کی ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے مسیب بن نجبہ کو دیکھا کہ وہ اسے پکڑ کر لا رہے تھے جبکہ لوگ اس کے گرد شور مچا رہے تھے ـــ یعنی ابن السوداء (ابن سبا) کو ـــ اور علی رضی اللہ عنہ اس وقت منبر پر تشریف فرما تھے۔ تو علی رضی اللہ عنہ نے دریافت

---

[38] ابن سعد، أبو عبد الله محمّد بن سعد الزهري، الطبقات الكبرى، ج 6، ص 192، طبعة دار صادر، بيروت.

فرمایا: اس کا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا: یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھتا ہے[39]۔

ھ۔ امام (ابن جریر) طبری نے نقل کیا ہے کہ قتادہ بن دعامہ سدوسی متوفی سن (117ھ/735ء) جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ عالی شان تلاوت فرماتے: (فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ...الآية -پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھا پن ہے...) تو وہ فرماتے: اگر اس سے مراد حروریہ (خوارج) او سبئیہ (عبد اللہ بن سبا کے پیروکار) نہیں ہیں، تو پھر میں نہیں جانتا (کہ اس سے کون مراد ہے)[40]۔

جیسا کہ بالکل واضح ہے، ان روایات کے ناقلین میں سے کسی نے بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ روایات سیف بن عمر سے نقل کی گئی ہیں؛ جو اس بات کی صریح دلیل ہے کہ یہ تاریخی خبر نقل کرنے میں سیف بن عمر تمیمی منفرد نہیں ہے، بلکہ یہ دیگر راویوں سے بھی مروی ہے جن میں سے بعض تو سیف پر زمانی

---

[39] ابن عساکر، مختصر تاریخ دمشق، مرجع سابق، م 12، ص 221.

[40] الطبري، أبو جعفر محمّد بن جرير، جامع البيان في تفسير القران، وبهامشه تفسير غرائب القران للنسيابوري، نشر دار الجيل، بيروت، ج3، ص 119.

اعتبار سے مقدم (پہلے) ہیں۔ اور اس کے باوجود کہ استاد مرتضیٰ عسکری سیف کی روایت کو قبول کرنے سے اس حجت کے ساتھ انکار کرتے ہیں کہ علمائے جرح وتعدیل نے اسے مجروح قرار دیا ہے — بطورِ محدث، نہ کہ بطورِ اخباری (تاریخی راوی) — ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ خود ابو مخنف[41] کی روایات کو بلا جھجک قبول کر لیتے ہیں، جبکہ علمائے جرح وتعدیل نے ابو مخنف کو بطورِ محدث اور بطورِ اخباری دونوں حیثیتوں سے مجروح اور ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔

ابو مخنف کے بارے میں امام ابن معین نے فرمایا ہے: وہ کچھ بھی نہیں ہے (یعنی روایت میں اس کی کوئی حیثیت نہیں)[42]۔ اور امام ذہبی نے اس کے متعلق فرمایا ہے: اور وہ تاریخ میں کوئی مستند یا بنیادی ستون نہیں ہے جیسا کہ سیف کا معاملہ ہے، بلکہ وہ تو ایک تباہ حال اور ناقابلِ اعتبار اخباری راوی ہے جس پر

---

[41] أبو مخنف: هو لوط بن يحيى بن سعد الأزدي الكوفي الإخباري، جرحه العلماء محدثا وإخباريا. ابن حجر, العسقلاني، لسان الميزان، نشر مطبعة مجلس إدارة المعارف النظامية بحيدر اباد الدكن، ج 4، ص 492.

[42] ابن حجر، العسقلاني، لسان الميزان، مرجع سابق، ج4، ص 492.

بھروسہ نہیں کیا جاسکتا[43]۔اور اسی طرح کے اوصاف کے ساتھ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں اس کی مذمت و تعریف کی ہے[44]۔

ابو مخنف نے خلیفہ ءراشد عثمان رضی اللہ عنہ کے فتنے کے واقعات میں سبئیہ گروہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، بلکہ اس کے ہاں عبد اللہ بن سبا کا سب سے پہلا تذکرہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت سے ملتا ہے؛ چنانچہ وہ ذکر کرتا ہے کہ معرکہ ءنہروان کے بعد علی رضی اللہ عنہ کے پاس ''عبد اللہ بن سبا عبد اللہ بن وہب الراسبی الہمدانی — جو خوارج کا سرغنہ تھا اور وہی ابن سبا ہے (جبکہ صحیح عبارت یوں ہے: وہ اور ابن سبا) — آئے، اور اس کے ہمراہ حجر الکندی، عمرو بن الحمق الخزاعی اور حبّہ بن جوین البجلی ثم العرنی بھی تھے؛ انہوں نے آپ سے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آپ کی رائے دریافت

---

[43] الذهبي، ميزان الاعتدال، مرجع سابق، ج3 ، ص 419.

[44] ابن حجر، لسان الميزان، مرجع سابق، ج4 ، ص 492.

کی، تو آپ ان پر سخت غضبناک ہوئے اور فرمایا: کیا تم لوگ اب دنیا کے تمام کام چھوڑ کر اسی کام کے لیے فارغ ہوئے ہو؟[45]۔

یہ روایت سیف بن عمر کے علاوہ کسی دوسرے اخباری کے ہاں اس بات کا پہلا اشارہ ہے کہ ابن سبا، علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے استحقاق کا عقیدہ رکھتا تھا۔ اور اس میں ایک ایسے اخباری کے ہاں ابن سبا کے وجود کا ثبوت بھی ملتا ہے جس پر خود مرتضیٰ عسکری پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ پھر ابو مخنف علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ''سبئیہ'' کا مختصر طور پر تذکرہ کرتا ہے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ وہ گروہ تھا جو علی رضی اللہ عنہ سے وفاداری کا دم بھرتا تھا۔ اور زیاد بن ابیہ نے حجر بن عدی الکندی[46] اور ان کے ساتھیوں کو

---

[45] أبو الشعر، هند، حركة المختار بن أبي عبيد في الكوفة، مرجع سابق، ص 332. نقلا عن انساب البلاذري، مرجع سابق، ج5، ص59.

[46] حجر بن عدي: عده البخاري من التابعين، وكان من شيعة علي في الجمل وصفين روى ابن سيرين أن ابن زياد، وهو أمير للكوفة خطب خطبة أطال فيها، فنادى حجر بن عدي: الصلاة، فمضى زيد في خطبته، فصحبه عدي بحجر وشاركه آخرون، فكتب زياد إلى معاوية يشكو إليه بغي حجر بن عدي على أميره في بيت الله، فكتب معاوية إلى زياد أن سرح به إلي، فلما جيء به إلى معاوية أمر بقتله متعظا بعاقبة عثمان، وما جراه تمادي الذين اجترأوا عليه ابن العربي، أبو بكر محمد بن عبد الله، ابن العربي، العواصم من القواصم، تحقيق محب الدين الخطيب، ط3، المكتبة السلفية بمصر، هامش ص212.

”السبئية الجانية“(جنایت کار سبئی)[47]اور”الترابية السبئية“(مٹی سے منسوب سبئی گروہ)[48]کے اوصاف سے ملقب کیا۔ابو مخنف نے ذکر کیا ہے کہ شبث بن ربعی ریاحی نے مختار ثقفی کے ساتھیوں کا تمسخر اڑایا اور انہیں ”سبئیہ“قرار دیا؛اسی طرح کوفہ کے اشراف و عمائدین نے بھی مختار اور اس کے پیروکاروں کو”سبئیہ“کہا — اور یہ بات مختار ثقفی کے خلاف ان کے

حجر بن عدی:امام بخاری نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے،اور وہ(جنگِ)جمل اور صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں(شیعہ)میں سے تھے۔ابنِ سیرین نے روایت کیا ہے کہ زیاد بن ابی سفیان نے،جب وہ کوفہ کا گورنر تھا،ایک طویل خطبہ دیا،تو حجر بن عدی نے آواز لگائی:نماز کا وقت ہو گیا ہے!مگر ابنِ زیاد اپنے خطبے میں مصروف رہا،تو حجر نے اس کی طرف کنکری پھینکی اور دیگر لوگوں نے بھی اس کام میں ان کا ساتھ دیا۔چنانچہ زیاد نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس میں اس نے اللہ کے گھر میں اپنے امیر کے خلاف حجر بن عدی کی اس سرکشی کی شکایت کی۔تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو لکھا کہ اسے میرے پاس بھیج دو۔پس جب انہیں معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا،تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انجام سے عبرت پکڑتے ہوئے ان کے قتل کا حکم دے دیا،اور یہ کہ ان لوگوں کی درازیِ دستی نے حضرت عثمان پر کتنا بڑا فتنہ ڈھایا تھا جنہوں نے ان پر جرات کی تھی۔(حوالہ:ابنِ العربی، ابو بکر محمد بن عبد اللہ،العواصم من القواصم،تحقیق:محب الدین الخطیب،تیسرا ایڈیشن،المکتبۃ السلفیۃ مصر،حاشیہ صفحہ 212)۔

[47] البلاذري، احمد بن يحيى، (ت 297هـ)، انساب الأشراف، ج4، و ج5، القدس.

[48] الطبري، تاريخه، مرجع سابق، ج5 ، ص 775.

اس احتجاج کے دوران کی ہے جو معرکہ "جبانہ السبع" سے پہلے ہوا تھا جس میں مختار کو سن 66 ہجری میں فتح حاصل ہوئی تھی[49]۔ چنانچہ انہوں نے کہا تھا: مختار نےاور اس کے سبئی گروہ نے اپنے اسلافِ صالحین سے براءت و بیزاری کا اظہار کیا ہے[50]۔ بالکل اسی طرح خوارج نے بھی علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھیوں کو "سبئیہ"[51] کے نام سے پکارا۔اور یہ تمام روایات جو ابو مخنف سے مروی ہیں، اور اس سے پہلے کی وہ روایات جو سیف اور دیگر راویوں سے منقول ہوئیں، یہ سب اس بات کا فائدہ دیتی ہیں کہ عبد اللہ بن سبا اور اس کے پیروکار حقیقت کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے نہ کہ تخیل کی دنیا سے — جیسا کہ مرتضیٰ عسکری نے دعویٰ کیا ہے۔اور مرتضیٰ عسکری کا اس تاریخی خبر کو محض اس بنیاد پر مجروح اور مسترد کر دینا کہ یہ سیف سے مروی ہے، اپنی جگہ پر درست اور محلِ نظر نہیں ہے؛ کیونکہ یہ خبر سیف کے علاوہ دیگر مأخذ سے بھی وارد ہوئی ہے۔ پس عبد اللہ بن سبا کے اخبار واحوال کے لیے تنہا سیف ہی واحد

---

[49] الطبري، تاريخه، مرجع سابق، ج5، ص 25.

[50] الطبري، تاريخه، مرجع سابق، ج5، ص44.

[51] البلاذري، انساب الأشراف، مرجع سابق، ج5،ص212،والطبري،تاريخه،مرجع سابق،ج5،ص272،وج6،ص25،وص44، وأبو الشعر، هند، مرجع سابق،333.

مصدر نہیں ہے، جس طرح کہ حافظ ابن عساکر کی روایات کے طرق اور اسانید بھی صرف سیف پر منحصر نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی تاریخ میں ایسی متعدد روایات درج کی ہیں جن کی سند میں سیف سرے سے موجود ہی نہیں ہے، اور وہ تمام کی تمام روایات ابن سبا کے وجود کو ثابت کرتی ہیں اور اس کے احوال کی تصدیق کرتی ہیں۔

جس طرح اہلِ سنت کے مراجع کے علاوہ خود شیعی مصادر بھی متنوع اور کثیر ہیں جنہوں نے عبداللہ بن سبا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔اور ان شیعی مصادر میں فرق و مذاہب کی وہ مستند کتابیں شامل ہیں جن میں سرِفہرست الناشئ الاکبر (متوفی 293ھ) کی کتاب: مسائل الإمامة ومقتطفات من كتاب الأوسط في المقالات[52]،اور القمی (متوفی 301ھ) کی کتاب المقالات والفرق[53]،اور النوبختی (متوفی 310ھ) کی کتاب فرق الشیعہ[54] ہے۔ اور اسی طرح کتبِ رجال بھی اس کا ثبوت پیش کرتی ہیں، جن میں سے ایک رجال الکشی[55] ہے

---

[52] ابن عساكر،تاريخ مدينة دمشق،مخطوط في المكتبة الأزهرية،رقم(714)ورقة 124ب.

[53] الناشئ الأكبر،مرجع سابق،ص22-23.

[54] القمي،مرجع سابق،ص20.52-

[55] النوبختي،أبو محمّد الحسن بن موسى،1931،تصريح ريتر، استنبول،ص23.

(جس کے مؤلف ابو عمرو محمد بن عمر، متوفی 340 ہجری ہیں)[56]، انہوں نے اس کتاب میں ایک سے زائد ایسی مستند اور باقاعدہ اسانید سے مروی روایات نقل کی ہیں جو ابن سبا کی حقیقت و وجود کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی (متوفی 460ھ) کی کتاب رجال الطوسی[57] بھی اس کی شاہد ہے؛ اور یہ تمام شیعی مراجع ابن سبا کے وجود کو ثابت کرتے ہیں اور متأخرینِ شیعہ میں سے ان لوگوں کی علمی مذمت کرتے ہیں جنہوں نے عبد اللہ بن سبا کے وجود کا انکار کرنے یا اس کے احوال و اخبار میں شک و شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود، استاد مرتضیٰ عسکری نے ان تمام راویوں کے اخبار کو مسترد کر دیا، اور ثقہ حفاظِ حدیث نے جو کچھ نقل کیا تھا اس پر انہوں نے قناعت نہیں کی، اور انہوں نے ملل و نحل فرق و مذاہب کی کتابوں پر سخت طعن و تشنیع کی۔ اور بات یہیں تک محدود نہیں رہی کہ انہوں نے صرف علمائے اہل سنت کے اخبار و روایات کو رد کیا ہو، بلکہ انہوں نے تو خود ائمہ و اکابرینِ شیعہ کی لکھی ہوئی باتوں کو بھی یکسر رد کر دیا۔

---

[56] الكشي، أبو عمر محمّد بن عمر، (ت340هـ)، رجال الكشي، طهران، ص98-99.

[57] الطوسي، محمّد بن الحسن، (ت460هـ) رجال الطوسي، بغداد، ص51.

ثانیاً: ڈاکٹر کامل مصطفٰی الشیبی کے شبہات:

ڈاکٹر کامل مصطفٰی الشیبی نے اپنی کتاب الصلۃ بین التصوف والتشیع (تصوف اور تشیع کا باہمی تعلق) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ابن سبا کوئی اور نہیں، بلکہ در حقیقت جلیل القدر صحابی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ہی ہیں[58]۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ بات کہنے والے (ہدایت الو حکیم الہلی) ہیں[59] جو برطانوی یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اور ڈاکٹر علی الوردی نے اپنی کتاب وعاظ السلاطین (سلاطین کے واعظین) میں اسی بات کی تکرار کی ہے[60]۔ اور ڈاکٹر کامل الشیبی نے اس

---

58 عمار بن ياسر بن عامر بن مالك،كان حليفاُ لبني مخزوم،وكان والده من السابقين في الإسلام ،ابن حجر، الإصابة ،مرجع سابق ،ج2،ص505.

59 الوردي ،علي،1956م.مقال من طلاب الشهرهة،مجلة الثقافة الإسلامية–السنة الأولى،بغداد،العدد11.

60 الوردي،علي، 1954م، وعاظ السلاطين، بغداد، ص 272-274، والشيبي، كامل مصطفى، والصلة بين التصوف والتشيع ، ط2 ، دار المعارف ، مصر ، ص41 وما بعدها .

موقف کی پرزور تائید کرتے ہوئے کہا ہے: اور یہ دلائل مقنع (اطمینان بخش) اور منطقی ہیں، لیکن انہیں ایسے مراجع و نصوص کی ضرورت ہے جو عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو ابن السوداء اور ابن سبا کا نام دیے جانے کی تائید کرتے ہوں۔ پھر ڈاکٹر الشیبی کچھ ایسے دلائل و براہین پیش کرنے لگے جن کے بارے میں انہیں یہ وہم ہوا کہ وہ ان کے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں، اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ: ابن سبا ابن السوداء کے نام سے جانا جاتا تھا، اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ عمار کی کنیت بھی کس طرح ابن السوداء کہی جاتی تھی۔ عمار رضی اللہ عنہ ایک یمنی باپ کی اولاد تھے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ''ابنائے سبا'' (سبا کے بیٹوں) میں سے تھے؛ کیونکہ ہر یمنی کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ ''ابنِ سبا'' (سبا کا بیٹا) ہے، اور تمام اہلِ یمن اپنا نسب — سبا بن یشجب بن قحطان — سے جوڑتے ہیں۔ اور قرآنِ کریم میں ہے: ہدہد نے سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا کہ وہ ان کے پاس ''سبا'' سے آیا ہے، اور اس سے اس کی مراد یمن ہی تھا۔ مزید برآں، عمار رضی اللہ عنہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے شدید محبت رکھتے تھے، ان کے لیے لوگوں کو دعوت دیتے تھے، اور ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو ان کی بیعت پر ابھارتے تھے۔ اور عمار رضی اللہ عنہ عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مصر بھی گئے تھے اور وہاں لوگوں کو عثمان

رضی اللہ عنہ کے خلاف اکسانے لگے، جس پر وہاں کا گورنر ان سے نالاں ہو گیا اور ان پر سخت گرفت کرنے کا ارادہ کیا۔ اور یہ واقعہ بعینہِ اس خبر سے مشابہت رکھتا ہے جو ابنِ سبا کی طرف منسوب ہے کہ وہ مصر میں مقیم ہو گیا تھا، اور اس نے "فسطاط" کو اپنی دعوت کا مرکز بنالیا تھا اور وہاں سے اپنے حامیوں کو خطوط لکھنا شروع کیے تھے۔ اسی طرح ابنِ سبا کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ: عثمان نے خلافت ناحق لی ہے، اور اس کے حقیقی حق دار علی بن ابی طالب ہیں؛ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خود عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا اپنا کلام ہے؛ چنانچہ ایک دن عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کے فوراً بعد انہیں مسجد میں بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا: اے گروہِ قریش! یاد رکھو، اگر تم نے اس امرِ خلافت کو اپنے نبی کے اہلِ بیت سے ایک بار یہاں اور ایک بار وہاں پھیر دیا، تو میں تمہارے بارے میں اس بات سے مامون نہیں ہوں کہ اللہ اسے تم سے چھین کر دوسروں میں بانٹ دے، جس طرح تم نے اسے اس کے اصل حق داروں سے چھین کر نااہلوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اور ابنِ سبا کی طرف یہ بات بھی منسوب کی جاتی ہے کہ وہی وہ شخص تھا جس نے معرکۂ بصرہ (جنگِ جمل) کے دوران علی اور عائشہ رضی اللہ عنہما کے مابین صلح کی کوششوں کو سبوتاژ کیا تھا، اور اگر وہ نہ ہوتا تو ان دونوں کے درمیان صلح مکمل ہو جاتی، جیسا

کہ راوی بیان کرتے ہیں۔جو شخص معرکۂ بصرہ (جنگِ جمل) کے تفصیلی احوال کا مطالعہ کرتا ہے، وہ عمار رضی اللہ عنہ کو اس میں ایک سر گرم اور متحرک کردار ادا کرتے ہوئے پاتا ہے؛ چنانچہ وہی تھے جو امام حسن اور مالک اشتر کے ہمراہ کوفہ گئے تاکہ لوگوں کو علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہونے پر آمادہ کریں۔اور جنگ کے دوران علی رضی اللہ عنہ کے پہلو بہ پہلو عمار رضی اللہ عنہ کا کھڑا ہونا ہی ان اسباب میں سے تھا جو سید نا زبیر رضی اللہ عنہ کی ندامت اور جنگ سے دستبرداری کا باعث بنا۔ اور مؤرخین نے ابنِ سبا کے بارے میں کہا ہے کہ اسی نے ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ان کی (نام نہاد) اشتراکی دعوت پر ابھارا تھا؛ حالانکہ اگر ہم عمار رضی اللہ عنہ کا ابو ذر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعلق کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کا باہمی ربط انتہائی گہرا اور مضبوط تھا، کیونکہ وہ دونوں ایک ہی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور وہ ہے علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا مکتبِ فکر۔اور یہ تینوں حضرات باہم اکٹھے ہوتے، آپس میں مشورے کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون فرماتے تھے۔ڈاکٹر کامل الشیبی کہتے ہیں کہ: ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ابنِ سبا کوئی اور نہیں بلکہ خود عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ہی تھے؛ کیونکہ قریش عمار کو عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھنے والی تحریک کا سرغنہ سمجھتے تھے، لیکن وہ

شروع شروع میں ان کے نام کی صراحت نہیں کرنا چاہتے تھے،اس لیے انہوں نے کنایۃً انہیں ''ابنِ سبا'' یا''ابنِ السوداء''(سیاہ فام خاتون کا بیٹا) کا علامتی نام دے دیا۔راویوں نے پردے کے پیچھے چھپے حقائق سے بے خبر رہتے ہوئے اس معاملے کو اسی طرح آگے نقل کر دیا۔ پھر ڈاکٹر کامل مصطفیٰ الشیبی نے کچھ ایسی دلیلیں اور نصوص پیش کرنا شروع کیں جن کے بارے میں ان کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو ''ابن السوداء'' اور ''ابنِ سبا'' کا نام دیے جانے کی تائید کرتی ہیں[61]۔ ہم (اس کے جواب میں) یہ کہتے ہیں: جو شخص بھی ان منقولہ روایات میں غور و فکر کرے گا جنہیں ہم نے اوپر بیان کیا ہے، وہ یہ پائے گا کہ عبد اللہ بن سبا کی شخصیت ایک حقیقی شخصیت تھی جسے لوگ اچھی طرح جانتے تھے،اور وہ اس کی لچکدار طبیعت اور اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے بھی واقف تھے؛ کیونکہ یہ روایات بغیر کسی ابہام کے اس کے وجود کی حقیقت کی تصدیق کرتی ہیں۔ بلکہ عبد اللہ بن سبا کا تذکرہ کرنے والے راویوں کے درمیان تو اس بات پر گویا اجماع پایا جاتا ہے کہ وہ ایک یہودی تھا،

---

[61] الوردي ، وعاظ السلاطين ، مرجع سابق ، ص272 – ص274 ، وانظر الشيبي ، مرجع سابق ، ص41 وما بعدها .-

اور خود علمائے شیعہ (مثلاً النوبختی وغیرہ) نے بھی اس بات کی تائید کی ہے[62]۔ رہا یہ سوال کہ عبداللہ بن سبا کو "ابن السوداء" کیوں کہا گیا؟ تو امام طبری اور دیگر مؤرخین کے کلام سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن السوداء دراصل خود عبداللہ بن سبا ہی ہے؛ اور اسے یہ نام محض اس کی تذلیل و تحقیر کے لیے دیا گیا کیونکہ اس کی ماں سیاہ فام تھی، اور شاید اس لیے بھی کہ اس کی ماں حبشی تھی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور علامہ مقریزی نے اپنی کتاب الخطط[63] میں، اور ابنِ کثیر نے البدایہ والنھایہ[64] میں اس تطابق (کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں) کی توثیق کی ہے۔ چنانچہ امام طبری نے فرمایا: عبداللہ بن سبا صنعاء کا رہنے والا ایک یہودی تھا، اور اس کی ماں سیاہ فام (لونڈی)[65] تھی۔

---

[62] النوبختي ، مرجع سابق ، ص27

[63] المقريزي ، أبو العباس أحمد بن علي ، المواعظ والاعتبار بذكر الخ□ط والآثار ، دار ال□باعة المصرية ، بولاق ، ج2 ، ص334

[64] ابن كثير، أبو الفداء إسماعيل بن عمر، تحقيق ومراجعة محمَّد عبد العزيز النجار، مؤسسة دار العربي للنشر والتوزيع، م□بعة السعادة، ج2، ص356 .

[65] ال□بري ، تاريخه ، مرجع سابق ، ج5 ، ص98 .

جاحظ کی کتاب البیان والتبیین میں ایک روایت آئی ہے جس کے بعض فقروں میں یہ درج ہے: چنانچہ مجھے ابن السوداء ملا اور وہ ابنِ حرب ہے [66]۔ڈاکٹر جواد علی نے اسی روایت کے ذریعے عبد اللہ بن سبا کے وجود پر شک کے بادل مڈلانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ انہوں نے کہا: "اس روایت میں اہم بات یہ ہے کہ اس نے ابن السوداء کے باپ کے نام کی صراحت کر دی ہے اور اسے حرب پکارا ہے! لیکن یہ کون سا حرب ہے؟ تاریخ میں تو سینکڑوں اشخاص ایسے ہیں جو حرب کے نام سے جانے جاتے ہیں، پھر اس حرب کا باپ کون تھا..؟اور وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا[67]۔اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ کتاب البیان والتبیین کی یہ عبارت تحریف شدہ ہے، اور میرا یہ گمان ہے کہ اس روایت کی اصل یوں تھی: "**فلقینی ابن السوداء ھو وابن حرب**" (یعنی مجھے ابن السوداء ملا، وہ اور ابنِ حرب)، جس میں لفظ **ھو** کو واؤ پر مقدم کر دیا گیا ہے — اور اس طرح کرنے سے عبارت کا معنی بالکل درست ہو جاتا ہے۔واضح رہے کہ یہ ابنِ حرب جو ہے، یہی غالی سبئی گروہ کی ایک ذیلی

---

[66] الجاحظ ،أبو عثمان عمرو بن بحر، تحقيق عبد السلام هارون، ج3، ص46، كتاب العصر

[67] علي ، جواد ، مجلة الرسالة ، عدد 775 ، ص532 .

شاخ ''الفرقہ الحربیہ''(حربیہ فرقے)کا بانی ہے[68]۔ابنِ حرب ابنِ سبا کے پیروکاروں میں سے تھااور وہ انہی نظریات ومقالات کا قائل تھا جن کی دعوت عبد اللہ بن سبا نے دی تھی، پھر وہ اپنے غلو میں اس سے بھی آگے نکل گیا۔ بہرحال، اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر جواد علی نے جاحظ کی مذکورہ بالا روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے خود یہ کہا ہے: ''اور مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ جاحظ ابن السوداء سے مراد اسی عبد اللہ بن سبا کو لے رہا ہے جس کا تذکرہ فرق ومذاہب کی کتابوں کے مصنفین نے کیا ہے[69]۔

عبد القاہر بغدادی مصنفِ کتاب الفرق بین الفرق[70] نے اکیلے یہ رائے قائم کی ہے کہ ابن السوداء، ابن سبا کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہے؛ حالانکہ وہ افکار اور نظریات جو انہوں نے دوسرے یعنی ابن سبا کی طرف منسوب کیے ہیں، وہ اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں، جس سے

---

[68] الشهرستاني، مُحَمَّد بن عبد الكريم، الملل والنحل، تحقيق مُحَمَّد سيد الكيلاني – دار المعرفة ببيروت -، ج1 ، ص290-291, وانظر القمي، مرجع سابق، ص27-28، والنوبختي، مرجع سابق، ص27 .

[69] مجلة الرسالة، مرجع سابق، عدد 775 .

[70] البغدادي، مرجع سابق، ص227 .

مشرق (عجم) اور منحرف ادیان و مذاہب سے درآمد شدہ نظریات مروی ہوئے ہیں۔ مصنفِ الفرق نے امام شعبی کی اس روایت پر اعتماد کیا ہے جو دو اشخاص کے بارے میں بات کرتی ہے؛ جن میں سے پہلا: عبداللہ بن سبا ہے، جو اصل میں یمن کا ایک یہودی تھا، اور دوسرا: عبد اللہ بن السوداء ہے، جو حیرہ کا ایک یہودی تھا۔ جبکہ ہم اس سے پہلے یہ واضح کر چکے ہیں کہ ابن سبا اصل میں یمن ہی سے تھا، اور وہ بعد میں حیرہ میں آکر مقیم ہوا تھا، اور وہیں اس نے ان اکثر مقالات اور باطل عقائد کو ترتیب دیا جن کی اس نے دعوت دی تھی۔ اور ان دونوں کے درمیان یہ تفریق راویوں پر معاملہ خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے ہی ہوئی ہے، جیسا کہ امام شعبی ہی کی ایک دوسری روایت میں ان کے ساتھ ہوا جسے العقد الفرید کے مصنف نے نقل کیا ہے، جس میں یہ عبارت آئی ہے: "اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے انہیں آگ سے جلا دیا تھا، اور انہیں مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا تھا، ان میں سے ایک عبداللہ بن سبا تھا، جسے آپ نے ساباط کی طرف جلاوطن کیا، اور دوسرا عبداللہ بن سباب تھا[71]۔۔۔ چنانچہ امام شعبی نے اپنی اس روایت میں دو اشخاص کے نام ذکر کیے ہیں: ایک عبداللہ

[71] مجلة الرسالة، مرجع سابق، عدد 775 .

بن سبا، اور دوسرا عبداللہ بن سباب۔ اور جو شخص اس مقام کا مطالعہ کرتا ہے، وہ یہ تصور کر بیٹھتا ہے کہ یہ دوسرا شخص علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی محبت میں غلو کرنے والے سرغنوں میں سے تھا، اور وہ ابنِ سبا کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا، اور اس کے باپ کا نام سباب تھا۔۔۔ مگر جب ہم فرق و مذاہب کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو ہم یہ پاتے ہیں کہ وہ کتابیں عبداللہ بن سبا اور اس کے پیروکاروں کو سبئیہ بھی کہتی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ انہیں سبابیہ کے نام سے بھی موسوم کرتی ہیں۔ جیسا کہ کتاب الفرق بین الفرق میں آیا ہے: اس باب کی فصلوں میں سے پہلی فصل: سبابیہ کے قول کے ذکر میں، جو کہ عبداللہ بن سبا کے پیروکار ہیں[72]۔ اس نام سبابیہ کا ورود دیگر کتابوں میں بھی کثرت سے ہوا ہے، جیسے ابن قتیبہ کی کتاب عیون الاخبار؛ چنانچہ انہوں نے کہا ہے: قرآن کے مخلوق ہونے کا قول سب سے پہلے مغیرہ بن سعید عجلی نے اختیار کیا تھا اور وہ عبداللہ بن سبا یہودی کے پیروکاروں میں سے تھا"، اور انہوں نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: بے شک مغیرہ ایک سبابی تھا[73]۔ پس یہ تمام

---

[72] البغدادي، مرجع سابق، ص227 .

[73] ابن قتيبة الدينوري، أبو محمّد عبد الله ابن مسلم، عيون الأخبار، 1963م، طبع المؤسسة المصرية العامة للتأليف والترجمة والطباعة والنشر، ج1، ص148-149 .

نام دراصل ایک ہی مسمّٰی (شخصیت) کے لیے ہیں اور وہ عبد اللہ بن سبا ہے؛ اور انہیں یہ نام سبابیہ اس لیے دیا گیا کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہء کرام رضی اللہ عنہم کی تنقیص کرتے تھے اور ان کو برا بھلا کہنے سب و شتم کرنے اور ان پر طعن و تشنیع کرنے میں اپنی زبانیں دراز کرتے تھے۔ اور عبد اللہ بن سبا کا لقب "ابن السوداء" کے نام سے مشہور ہونا نہ تو اسے پسند تھا اور نہ ہی اس کے پیروکاروں کو یہ بھاتا تھا، کیونکہ یہ لفظ ہمیشہ تحقیر اور ذلت و رسوائی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ اسی لفظ کے ذریعے ایک مرتبہ مقداد بن اسود کو عار دلائی گئی اور انہیں کہا گیا: "اے سیاہ فام خاتون کے بیٹے!"، اور خود ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے یہ بات بلال حبشی رضی اللہ عنہ سے کہی تھی جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضی فرمائی تھی۔ پس یہ ممکن ہے کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ دیگر افراد کو (ان کی ماؤں کے رنگ کی وجہ سے) "ابن السوداء" کا کنایہ دیا گیا ہو، جس طرح کہ ابنِ سبا کو یہ کنایہ دیا گیا تھا؛ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں! اور جدید دور کے شیعی محققین نے عبد اللہ بن سبا کے وجود کو محض اس دعوے کے ساتھ مسترد کیا ہے کہ وہ (کوئی الگ مٹی کا انسان نہیں بلکہ) عمار بن یاسر ہی ہیں، یہ کہ ان کے بقول نواصب نے یہ تمام افکار اور نظریات — جو

اسلامی معاشرے میں غیر مسلم اقلیتوں کے درمیان پھیلے ہوئے تھے — عمار رضی اللہ عنہ کے سر مڑھ دیے، تاکہ وہ تشیع کی ابتدا اور غلو کا سارا الزام عبد اللہ بن سبا پر ڈال سکیں۔ حالانکہ فرق و مذاہب کے مؤرخین اور مصنفین نے، خواہ وہ اہل سنت ہوں یا شیعہ، ابنِ سبا کو غالی تشیع کے بانی اور رہنما کے طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ جدید دور کے شیعی محققین کا ردِ عمل یہ رہا کہ انہوں نے عبد اللہ بن سبا کو ایک فرضی نام قرار دے دیا جسے امویوں نے اپنے مخالف عمار بن یاسر کے لیے گھڑا تھا۔ اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عمار بن یاسر کو — ان کے معروف علمی و ایمانی مقام کے ساتھ — اپنے مذہب کا اولین بانی اور رہنما ثابت کر سکیں۔ پھر یہ کہ یہ رائے — جسے ڈاکٹر علی الوردی اور ڈاکٹر کامل مصطفیٰ الشیبی وغیرہ نے اختیار کیا ہے — اس کی تردید جرح و تعدیل کی تمام کتابیں اور خود شیعہ ہی کے ہاں معتبر کتبِ رجال کرتی ہیں؛ کیونکہ وہ کتابیں عمار بن یاسر کا ذکر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اصحاب اور ان سے روایت کرنے والے راویوں کے ضمن میں کرتی ہیں، اور پھر کسی دوسرے مقام پر عبد اللہ بن سبا کا مستقل تذکرہ اس کی مذمت، سب و شتم اور لعن طعن کے سیاق میں کرتی ہیں۔ تو کیا (ایسی واضح تفریق کے بعد بھی) ان دونوں افراد کو ایک ہی شخصیت تسلیم کرنا ممکن ہے؟

اگرڈاکٹر علی الوردی اوران کے متبعین یہ رائے رکھتے ہیں کہ (ان دونوں کے ایک ہونے کا)ایک سبب یہ بھی ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ دونوں ہی مصر گئے تھے، تو تاریخی نصوص کا گہرا مطالعہ (استقراء)اور ان کی تاریخ کی معرفت ایک بالکل مختلف مفہوم سامنے لاتی ہے جو ڈاکٹر الوردی کے فہم کے برعکس ہے؛ اور نتیجتاً یہ بات ان دونوں شخصیتوں کے الگ الگ اور آزاد ہونے پر ایک واضح دلیل بن جاتی ہے۔ کیونکہ عمار رضی اللہ عنہ کو تو عثمان رضی اللہ عنہ نے سن 35 ہجری میں مصر بھیجا تھا، اور مصر میں جن لوگوں نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو اپنے زیرِاثر لانے کی کوشش کی تھی، ان میں عبد اللہ بن سبا، خالد بن ملجم، سودان بن حمران اور کنانہ بن بشر جیسے لوگ شامل تھے۔اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مقربین سے اس وقت خصوصی مشورہ طلب کیا جب ان کے کانوں تک مختلف شہروں (امصار) میں رعایا کی ناراضی اور بے چینی کی خبریں پہنچیں۔ چنانچہ انہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: ہم آپ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ ان شہروں کی طرف ایسے مردوں کو تحقیقات کے لیے بھیجیں جن پر آپ کو پورا بھروسہ ہو، تاکہ وہ وہاں کے احوال کی خبریں لے کر آپ کے پاس لوٹیں؛ چنانچہ انہوں نے محمد بن مسلمہ کو بلایا اور انہیں کوفہ روانہ کیا، اسامہ بن زید کو

بصرہ بھیجا، عمار بن یاسر کو مصر روانہ کیا، اور عبد اللہ بن عمر کو شام بھیجا، اور ان کے علاوہ بھی کئی مردوں کو مختلف جگہوں پر روانہ کیا[74]۔ پس اس ٹھوس تاریخی حقیقت سے معلوم ہوا کہ وہ دو الگ الگ اشخاص ہیں نہ کہ ایک ہی شخص۔ اسی طرح تاریخی اور نفسیاتی حالات بھی ہمیں اس بات کی ہر گز اجازت نہیں دیتے کہ ہم ان دونوں کو ایک ہی شخصیت قرار دیں؛ کیونکہ اگر ایسا مانا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ہی وہ شخص تھے جنہوں نے حضرت علی کے لیے وصیتِ خلافت، رجعت (دوبارہ دنیا میں لوٹنے)، مہدویت اور زندقہ (الحاد) کے نظریات پھیلائے تھے! اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی نسبت کوئی بھی شخص جلیل القدر صحابی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی طرف کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان دونوں شخصیتوں کو ایک اور متحد ماننے سے عمار رضی اللہ عنہ کی طرف یہودی ہونے کی نسبت بھی لازم آئے گی، جبکہ عبد اللہ بن سبا کے یہودی ہونے کو خود اہلِ سنت اور شیعہ دونوں ہی کے مؤرخین نے ثابت کیا ہے۔ رہا ان دونوں کا ایک ہی کنایہ یا لقب ابن السوداء پر متفق ہونا، تو یہ اس بات کی قطعی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ ایک ہی

---

[74] الطبري، تاريخه، مرجع سابق، ج4، ص348.

شخص ہیں؛ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کی بہت سی نامور شخصیات (اعلام) کنایات اور القابات میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں، اور اسی وجہ سے تو مؤرخین نے ناموں، کنایات اور القابات کی اس باہمی مشابہت پر مستقل کتابیں (کتبِ تشابہ الاسماء والکنی) تصنیف کی ہیں تاکہ ان کے درمیان فرق کو واضح کیا جاسکے۔

ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان ہو چکی ہیں، ہمارے سامنے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر علی الوردی اور جس کسی نے بھی اس نظریے میں ان کی پیروی کی ہے، وہ حق اور درستی سے دور نکل گئے ہیں؛ اور ہم نے ان کے رد میں جو کچھ بھی دلائل پیش کیے ہیں، وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی اور وافی ہیں۔

ثالثاً: ڈاکٹر طہ حسین کے شبہات:

ڈاکٹر طہ حسین نے اپنی کتاب الفتنۃ الکبریٰ میں اس فتنے کے معاملے پر تفصیلی بحث کی ہے جس کے شعلے عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری حصے میں بھڑک اٹھے تھے، اور جس کا انجام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ

کی شہادتپر ہوا ــــ ایک ایسی شہادت کہ اس وقت تک کی تاریخِ اسلام نے اس سے زیادہ ہولناک اور وحشت ناک واقعہ نہیں دیکھا تھا۔ طٰہ حسین نے یہ بحث اس طریقے سے کی جس سے ان کا مقصد ــــ اپنے مخصوص منہج پر چلتے ہوئے ــــ شک و شبہات کے بیج بونا تھا؛ جس کے لیے انہوں نے مبہم مراجع اور ادھوری و کٹی پھٹی روایات پر بھروسا کیا، اور معتبر اسلامی مراجع و مصادر کو پسِ پشت ڈال دیا۔ انہوں نے فتنے کی روایات کو ان کے راویوں کے بیان کے مطابق بغیر کسی جانچ پڑتال کے جوں کا توں نقل کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا ایک واضح فکری جھکاؤ ہوا و ہوس بھی تھا، جسے انہوں نے اپنی تحریر کا ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد ہی ظاہر کیا۔ اور طٰہ حسین کے اس طرزِ عمل کا دندان شکن جواب دینے کی زحمت سے ہمیں عربی زبان کے مایہ ناز مرحوم ادیب محمود محمد شاکر نے سبکدوش کر دیا، چنانچہ انہوں نے فرمایا ہے: چنانچہ فتنہ تو بس ایک خالص عربی فتنہ تھا، جو مالداروں کے آپس میں دولت اور اقتدار کے لیے باہمی کھینچا تانی، اور عرب کے عام لوگوں (عوام) کے ان مالداروں سے حسد کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ اور آپ کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اس صفت (یعنی عربی فتنہ اور عرب عوام) کے بار بار دہرائے جانے پر گہری نظر ڈالیں، تاکہ آپ جان سکیں کہ وہ اس تکرار سے کیا چاہ رہے

ہیں، اور طہٰ حسین عثمان رضی اللہ عنہ کے خونِ ناحق میں غیر عربوں میں سے کسی کی بھی شرکت کی کس طرح نفی کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی چند صفحات بھی نہیں گزرتے کہ ہمارے سامنے ایک نیا باب آتا ہے جو یوں شروع ہوتا ہے: وہاں ایک ایسا قصہ بھی ہے جسے تاریخ لکھنے والے بڑے بڑے راویوں نے بہت اہمیت دی ہے، اور اس میں حد سے زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے؛ یہاں تک کہ بہت سے قدیم اور جدید اہلِ علم نے اسے عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہونے والے اختلافات کا بنیادی مأخذ قرار دے دیا، اور اسی اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں میں وہ تفرقہ پیدا ہوا جس کے اثرات اب تک نہیں مٹ سکے۔ اور وہ عبداللہ بن سبا کا قصہ ہے جو ابن السوداء کے نام سے جانا جاتا ہے۔ راویوں نے کہا ہے: عبداللہ بن سبا صنعاء کا رہنے والا ایک یہودی تھا جس کی ماں حبشی تھی، پھر وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بظاہر اسلام لے آیا، اور پھر وہ مختلف شہروں میں گھومنے پھرنے لگا تاکہ عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشیں کرے، لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکائے، ان پر ابھارے، اور عوام میں ایسے نو ایجاد

باطل نظریات پھیلائے جنھوں نے دین اور سیاست دونوں کے بارے میں ان کی رائے کو بگاڑ کر رکھ دیا[75]۔

پھر طہ حسین کہتے ہیں: اور بہت سے لوگ ابنِ السوداء ہی کی طرف ہر اس بگاڑ اور اختلاف کو منسوب کرتے ہیں جو عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلامی بلاد میں ظاہر ہوا تھا، اور ان میں سے کچھ تو اس طرف جاتے ہیں کہ اس نے اپنی سازش کو نہایت مضبوطی سے مستحکم کیا تھا، چنانچہ اس نے مختلف شہروں میں ایسے خفیہ گروہ منظم کیے جو پردہء راز میں رہ کر سازشیں کرتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو فتنے کی دعوت دیتے تھے، یہاں تک کہ جب حالات ان کے لیے سازگار ہو گئے، تو انہوں نے خلیفہ پر دھاوا بول دیا، اور پھر وہی کچھ ہوا جو خروج، محاصرے اور امام کی شہادت کی صورت میں سامنے آیا۔ ہم اس عبارت سے دیکھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر طہ حسین نے اس بات پر کیوں اصرار کیا تھا کہ وہ فتنے کو عربی قرار دیں اور یہ کہیں کہ جو عوام اس فتنے کے شر پسند تھے وہ عرب عوام تھے؛ یعنی ان کے نزدیک اس فتنے میں عبد اللہ بن سبا کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، اور نہ ہی اس کی آگ کو بھڑکانے میں یہودیوں کا کوئی کردار تھا۔ پھر

---

[75] حسين، طه، الفتنة الكبرى، دار المعارف، مصر، ص109 .

ڈاکٹر صاحب اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے فوراً بعد کہتے ہیں: مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ جو لوگ ابنِ سبا کے معاملے کو اس حد تک بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، وہ اپنے آپ پر اور تاریخ پر بہت سخت زیادتی اور مبالغہ آرائی کرتے ہیں۔ اور سب سے پہلی چیز جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم ان اہم مراجع میں ابنِ سبا کا کوئی تذکرہ نہیں پاتے جنہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہونے والے اختلافات کا احوال بیان کیا ہے؛ چنانچہ بلاذری نے اپنی کتاب انساب الاشراف میں اس کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ میری نظر میں یہ کتاب اس قصے کے لیے سب سے اہم اور سب سے زیادہ مفصل مأخذ ہے۔ جبکہ طبری نے اس کا ذکر سیف بن عمر کی روایت سے کیا ہے، اور بظاہر اسی سے ان مؤرخین نے یہ بات اخذ کی ہے جو ان کے بعد آئے[76]۔ پھر انہوں نے کہا: اور میں نہیں جانتا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ابنِ سبا کی کوئی حیثیت (یا خطرہ) تھی بھی یا نہیں۔۔؟ لیکن میں اس بات پر قطعی یقین رکھتا ہوں کہ اس کی حیثیت — اگر کوئی حیثیت تھی بھی — تو وہ کوئی قابلِ ذکر نہ تھی؛ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے مسلمان ایسے نہ تھے کہ اہل کتاب میں سے

---

[76] حسين، طه، مرجع سابق، 131 .

عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے میں بظاہر اسلام لانے والا کوئی نووارد شخص ان کی عقلوں، ان کے نظریات اور ان کی سلطنت کے ساتھ کھلواڑ کر جاتا۔ یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں: پس ہمیں اس سارے معاملے میں احتیاط، توقف اور چھان پھٹک کا موقف اختیار کرنا چاہیے؛ اور ہمیں مسلمانوں کو اس سے کہیں بلند و برتر سمجھنا چاہیے کہ صنعاء سے آنے والا ایک ایسا شخص ان کے دین، ان کی سیاست، ان کے نظریات اور ان کی حکومت کے ساتھ کھلواڑ کر جائے جس کا باپ یہودی اور ماں سیاہ فام تھی، اور وہ خود بھی یہودی تھا، پھر وہ نہ تو کسی شوق سے اور نہ ہی کسی خوف سے اسلام لایا، بلکہ محض مکر، سازش اور دھوکہ دہی کے لیے مسلمان ہوا، اور پھر اسے مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں وہ کامیابی بھی حاصل ہو گئی جو وہ چاہتا تھا، یہاں تک کہ اس نے مسلمانوں کو ان کے خلیفہ کے خلاف بھڑکایا اور انہوں نے خلیفہ کو شہید کر دیا! پھر وہ کہتے ہیں: یہ تمام ایسی باتیں ہیں جو عقل کے ترازو پر پوری نہیں اترتیں، نہ ہی نقد و جرح کے سامنے ٹھہر سکتی ہیں، اور نہ ہی ان پر تاریخ کے معاملات کی بنیاد رکھی جانی چاہیے[77]۔ اس طرح ڈاکٹر طہ حسین یکمشت اپنا قطعی فیصلہ سنا دیتے ہیں، اور پھر وہ اسی ڈگر پر آگے

---

[77] حسين، طه، مرجع سابق، 134 .

بڑھتے ہوئے کہتے ہیں: یہاں اس خط (مکتوب) کا قصہ سامنے آتا ہے جس کے بارے میں راوی کہتے ہیں کہ اہلِ مصر نے اسے مصر واپس لوٹتے ہوئے پکڑا تھا، جس کے بعد وہ غصے میں دوبارہ واپس آ گئے۔ پس یہ قصہ میری نظر میں سرے سے ہی من گھڑت ہے۔ پھر انہوں نے اس خط کے پورے واقعے کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا اور کہا: یہ سب کچھ ایک لغو اور مضحکہ خیز ڈرامے سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ یہ کوئی ایسا واقعہ ہو جو حقیقت میں پیش آیا تھا۔ حالانکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سادہ تھا؛ (اصل بات یہ تھی کہ) مختلف شہروں کے لوگوں نے اپنے امام عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک وعدہ لیا تو وہ اس پر مطمئن ہو گئے، پھر بعد میں ان پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ خلیفہ نے اپنے وعدے کو سچا نہیں کیا۔۔! چنانچہ وہ بپھرے ہوئے باغیوں کی صورت میں آگے بڑھے، اور وہ اس معاملے سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے تھے اور اس وقت تک واپس لوٹنے کے لیے تیار نہیں تھے جب تک اس کا فیصلہ نہ کر لیں۔ پھر ڈاکٹر طٰہٰ حسین پر یہ واضح ہوا کہ اس خط کو سرے سے ہی خارج (اور کالعدم) قرار دے دینا جو مصر کے گورنر کی طرف بھیجا گیا تھا اور جس میں مصر سے آنے والے وفد کے سرغنوں کو قتل کرنے کا حکم تھا — اس وفد کی مدینے کی طرف دوبارہ واپسی کے اشکال کو حل نہیں کرتا، جب وہ مدینہ سے جدا ہو کر

مصر کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اور ان پر یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ (ان کے اپنے خود ساختہ نظریے کے مطابق) شہروں کے لوگوں پر یہ بات کھلی تھی کہ خلیفہ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا، یعنی (طٰہٰ حسین کے دعوے کے مطابق) خلیفہ نے ان سے صریح لفظوں میں جھوٹ بولا تھا۔ لیکن اگر وہ اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتے کہ ان باغیوں پر یہ بات کیسے کھلی کہ خلیفہ نے ان سے جھوٹ بولا ہے؟ تو انہیں کوئی جواب نہ سوجھتا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس مفروضے کو جوں کا توں پیش کر دیا اور اس پر یہ اضافہ بھی کر دیا کہ وہ بپھرے ہوئے باغیوں کی طرح آگے بڑھے، طٰہٰ حسین کہتے ہیں: پھر جب وہ مدینہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ان سے قتال کے لیے تیار بیٹھے ہیں، چنانچہ انہوں نے اس لڑائی کو ناپسند کیا اور واپسی کے لیے روانہ ہو گئے: یہاں تک کہ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان بزرگ صحابہ نے اپنے ہتھیار رکھ دیے ہیں اور اپنے گھروں میں پر امن ہو کر بیٹھ گئے ہیں، تو وہ دوبارہ پلٹ آئے اور بغیر کسی لڑائی کے مدینہ پر قبضہ کر لیا۔'' لیکن ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے خود محسوس کیا کہ ان کی یہ رائے سرتاپا ناقص اور کمزور ہے، کیونکہ اس کی تائید کسی دوسرے مفروضے سے نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے غور و فکر کیا اور اندازے لگائے، پھر کہنے لگے: اور میں اس بات پر تقریباً قطعی یقین رکھتا ہوں

کہ مدینہ کے لوگوں میں سے ہی کچھ ان کے مددگار موجود تھے جنہوں نے انہیں دوبارہ بلایا، ان کی حوصلہ افزائی کی، پھر انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے ارادوں سے باخبر کیا، اور پھر انہیں یہ اطلاع دی کہ مدینہ دوبارہ امن وسکون کی حالت پر لوٹ آیا ہے؛ اور پھر جب ان باغیوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا تو یہ لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے[78]۔ اور یہ سب کچھ — جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں — محض فرضی باتیں اور تخیلاتی باتیں (قیاس آرائیاں) ہیں، اور ساتھ ہی یہ اس بات کا اعتراف بھی ہے جس کا انہوں نے عبد اللہ بن سبا کے معاملے میں خود ہی انکار کیا تھا؛ یعنی ایسے خفیہ گروہوں کی تنظیم جو پردہء راز میں رہ کر سازشیں کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ (طہ حسین) وہاں (ابنِ سبا کے معاملے میں) تو اس اصول کا انکار کرتے ہیں، لیکن یہاں (مدینہ کے لوگوں کے معاملے میں) خود ہی اس کا اقرار کر رہے ہیں۔

ہم ڈاکٹر طہ حسین کے کلام کی باریک بینی سے تفتیشکرنے میں طوالت کے خوف سے ان کے کلام میں سے صرف ان دو موضوعات کے جائزے پر ہی اکتفا کرتے ہیں؛ ورنہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے ہر ہر حرف کے نیچے

---

[78] حسين، طه، مرجع سابق،ص209 .

بہت سی ایسی علمی باتیں پوشیدہ ہیں جن کی گہری تفتیش، چھان پھٹک اور انہیں حق کے ان پہلوؤں کی طرف لوٹانا ناگزیر ہے جن سے ہٹ کر وہ دوسری طرف چلے گئے ہیں۔ اور میں ان کے کلام کو نقل کرنے میں طوالت اختیار کرنے پر بالکل مجبور ہوا ہوں، تاکہ ان کی گفتگو اور علم کے پردے میں چھپے مکر کا کوئی بھی حصہ ہم سے چھوٹ نہ جائے۔ ڈاکٹر طہ حسین نے اپنی گفتگو کا آغاز اس یہودی یعنی ابنِ السوداء عبد اللہ بن سبا کے قصے کو ساقط اور خارج کرنے سے کیا؛ چنانچہ انہوں نے ذکر کیا کہ بعد کے دور کے راویوں نے اس کے معاملے کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا، اس میں حد سے زیادہ مبالغہ آرائی کی، اور یہ کہ یہ قصہ اہم مراجع میں وارد نہیں ہوا، اور ابنِ سعد نے اس کا ذکر نہیں کیا، اور بلاذری نے بھی انساب الاشراف میں اس کا تذکرہ نہیں کیا حالانکہ ڈاکٹر کی نظر میں یہ سب سے اہم مأخذ ہے — اور یہ کہ جس نے اس کا ذکر کیا ہے وہ صرف طبری ہیں اور "بظاہر ان کے بعد آنے والے مؤرخین نے یہ بات انہی سے اخذ کی ہے" جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ ڈاکٹر طہ حسین کا یہ کہنا کہ "بعد کے دور کے راوی (الرواۃ المتأخرین)"، اس میں ایک بہت بڑا اور بظاہر جان بوجھ کر پیدا کیا گیا ابہام (دھوکہ) موجود ہے؛ کیونکہ طبری بعد کے دور کے راویوں میں سے ہر گز نہیں ہیں۔ وہ تو سن 225 ہجری میں پیدا ہوئے اور

سن 310 ہجری میں وفات پائی، چنانچہ وہ بلاذری کے معاصر (ہم عصر) ہیں، اور الطبقات کے مصنف ابنِ سعد کے شاگردوں کے طبقے میں سے ہیں۔ اور سیف بن عمر، جن کی روایت سے طبری نے یہ خبر نقل کی ہے، وہ قدیم دور کے بڑے مؤرخین میں سے ہیں؛ وہ تو طبری اور بلاذری کے شیوخ کے بھی شیوخ (استادوں کے استاد) ہیں، اور ابنِ سعد کے شیوخ کے مرتبے میں آتے ہیں، کیونکہ ان کی وفات ہارون الرشید کے زمانے میں یعنی سن 190 ہجری سے پہلے ہوئی تھی۔ لہٰذا نہ تو سیف بن عمر کے بارے میں اور نہ ہی طبری کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "بعد کے دور کے راویوں" میں سے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر طٰہ اپنے قاری کو دھوکے میں رکھنا چاہتے تھے۔

اور اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ "اہم مراجع (**المصادر المهمة**)"، اس میں بھی ایک شدید قسم کا ابہام اور سراسر حد سے بڑھی ہوئی ناانصافی اور علمی بددیانتی پائی جاتی ہے؛ کیونکہ اگر امام طبری کی کتاب (تاریخ الرسل والملوک) بھی "اہم مراجع" میں شمار نہیں ہوگی، تو کاش میں جان سکتا کہ پھر وہ کون سے اہم مراجع ہیں جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں؟!

پھر یہ کہ ڈاکٹر طہٰ حسین اچھی طرح جانتے ہیں کہ ابنِ سعد کی کتاب الطبقات الکبریٰ جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے، وہ ایک ناقص (نامکمل) کتاب ہے اور اسے مختلف نسخوں سے جوڑ کر تیار کیا گیا ہے، جن میں سے کچھ نسخے مکمل ہیں، کچھ ناقص ہیں اور کچھ مختصر ہیں۔ اور اس بات کی دلیل — جس معاملے پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں — یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوانح (ترجمہ) تو 48 صفحات میں بیان کیے، اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوانح 33 صفحات میں لکھے؛ لیکن جب وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تذکرے پر آئے — حالانکہ ان کے دورِ خلافت کے واقعات وہ ہیں جنہیں ڈاکٹر طہٰ بھی جانتے ہیں اور عام لوگ بھی جانتے ہیں — تو انہوں نے صرف 22 صفحات لکھے؛ اور پھر جب انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا — جبکہ ان کے زمانے کے معاملات تو اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین اور کٹھن تھے — تو ان کے بارے میں صرف 16 صفحات لکھے۔

عبداللہ بن سبا کی خبر کی نفی کرنے میں ڈاکٹر طہٰ حسین کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ بلاذری نے اس کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ ان کی نظر میں یہ کتاب "اس قصے کے لیے سب سے اہم اور سب سے زیادہ مفصل مأخذ" ہے۔ لیکن پھر انہوں

نے پلٹ کر اس خط (مکتوب) کی خبر کی بھی نفی کر دی جس میں مصر کے وفد کو قتل کرنے کا حکم تھا، حالانکہ بلاذری نے اس خط کے واقعے کو تفصیلاً ذکر کیا ہے اور اس میں ایسی باتیں لائے ہیں جو کسی دوسری کتاب وغیرہ میں نہیں ملتیں۔ اور آپ نہیں سمجھ پاتے کہ یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے کہ طہ حسین کسی خبر کا بلاذری کی کتاب میں نہ ہونا تو اس کی نفی پر دلیل بنا لیں، لیکن پھر دوسری طرف ایک ایسی خبر کی بھی نفی کر دیں جسے بلاذری نے خود ذکر کیا ہو اور اس میں تفصیل سے کام لیا ہو؟! ڈاکٹر طہ حسین یہ بھی جانتے ہیں کہ بلاذری کی کتاب (انساب الاشراف) کا جو حصہ دستیاب ہوا ہے وہ بہت ہی قلیل حصہ تھا؛ جس کا ایک حصہ سن 1883ء میں جرمنی میں طبع ہوا، پھر اس کے دوسرے حصے کو سن 1938ء میں بیت المقدس (یروشلم) میں یہودیوں کے سرغنوں میں سے ایک شخص نے چھاپنے کا ذمہ لیا۔اور اس یہودی ناشر نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ کچھ ایسے واقعات ہیں جو یزید بن معاویہ کے عہد میں پیش آئے جیسے واقعہء کربلا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت — لیکن ان کا تذکرہ یزید کے سوانح میں نہیں کیا گیا، بلکہ انہیں آلِ ابی طالب کے سوانح میں ذکر کیا گیا ہے،اور ایسا کتاب کے اس مروجہ نظام کے تحت ہوا ہے جو شجرہء نسب (انساب) کے تسلسل کے مطابق ہے۔ تو کیا پھر یہ جائز اور ممکن

نہیں ہے کہ بلاذری نے عبداللہ بن سبا کے معاملے کو بھی کسی دوسرے مقام پر شامل کر دیا ہو، جیسا کہ انہوں نے اس واقعے میں کیا جس کا مشاہدہ اور تذکرہ کتاب کے یہودی ناشر نے کیا ہے؟ یہ سب کچھ ممکن ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب جب کسی چیز کی نفی کرنا چاہتے ہیں، تو وہ اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتے کہ وہ ان تمام حقائق کو پھلانگ جائیں اور ان سے آنکھیں موند لیں، تاکہ وہ اس معاملے میں وہی رائے قائم کر سکیں جس کی ان کو خواہش ہے اور جسے وہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ بغیر کسی ہچکچاہٹ اور بغیر کسی توقف کے، ڈاکٹر طہ حسین دراصل یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ فتنہ جس کا انجام حضرت عثمان رضی اللہ عن کی شہادت پر ہوا، وہ صرف ایک عربی فتنہ تھا جو مالداروں کے آپس میں دولت اور اقتدار کے لیے باہمی کھینچا تانی، اور عرب کے عام لوگوں کے ان مالداروں سے حسد کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا"۔ پس اپنے اس بڑے (اور مضحکہ خیز) دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے، انہوں نے فتوحات کے بعد کے ابتدائی اسلامی معاشرے کی زندگی کو ایک ایسی تصویر میں ڈھالنے کے لیے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کیا جو صرف اور صرف اسی ایک مقصد پر جا کر ختم ہو؛ اور وہ مقصد دولت، مال، اور مال و دولت اور اقتدار کے لیے مالداروں کی باہمی کھینچا تانی، اور عرب عوام کا ان دولت، مال اور اقتدار والوں سے حسد کرنا

تھا۔ جس طرح طہٰ حسین نے ایک اور ہدف کو اس وقت بے نقاب کیا جب انہوں نے یہودی عبداللہ بن سبا کی خبر، اور اس خط کی خبر کی نفی کی جس میں مصر کے وفد کے سرغنوں کو قتل کرنے کا حکم تھا۔ اور یہ ہدف یہ تھا کہ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے خونِ ناحق میں اور امام کے خلاف قتل پر اکسانے میں یہودیوں کی شرکت کی نفی کر دیں۔ اس کے لیے انہوں نے ایک نہایت دشوار گزار اور پر پیچ راستہ اختیار کیا، جس میں انہوں نے روایات کی جرح و تعدیل چھان پھٹک میں علماء کے مسلمہ اسلوب کی صریح مخالفت کی؛ چنانچہ انہوں نے بغیر کسی دلیل کے کسی معاملے میں راویوں کو جھٹلا دیا، اور بغیر کسی دلیل کے دوسرے معاملے میں انہی راویوں کو سچا مان لیا۔ حالانکہ وہ خود اپنی کتاب میں ان لوگوں پر ملامت کرتے ہیں "جو ان روایات کو جھٹلاتے ہیں جو لوگوں کے درمیان ہونے والے فتنے اور اختلاف کے احوال ہم تک نقل کرتی ہیں"، چنانچہ انہوں نے (خود ہی اپنے اس موقف کے خلاف) کہا تھا: چنانچہ اگر ہم نے ایسا کیا یعنی روایات کو جھٹلایا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہم بعثتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک کی پوری اسلامی تاریخ ہی کو جھٹلا دیں؛ کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے فتوحات کی خبریں، غزوات کے احوال اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کی سیرت کو روایت کیا ہے، تو پھر یہ

کیسے مناسب ہو سکتا ہے کہ جب وہ ایسی باتیں روایت کریں جو ہمیں بھلی لگتی ہوں تو ہم ان کی تصدیق کر دیں، اور جب وہ ایسی باتیں روایت کریں جو ہمیں پسند نہ ہوں تو ہم انہیں جھٹلا دیں؟! اور ہمارے لیے یہ ہر گز جائز نہیں کہ ہم تاریخ کے کچھ حصے کو سچا مانیں اور کچھ دوسرے حصے کو جھٹلا دیں، صرف اس وجہ سے کہ اس کا کچھ حصہ ہمیں خوش کرتا ہے اور کچھ حصہ ہمیں تکلیف پہنچاتا ہے"۔ لیکن خود ڈاکٹر طہ حسین — جو اس کلام کے کہنے والے ہیں — انہوں نے بعینہٖ یہی کام کر ڈالا! چنانچہ انہوں نے راویوں کو اس وقت جھٹلا دیا جب انہوں نے کوئی ایسی بات روایت کی جو انہیں پسند نہیں تھی اور جو انہیں تکلیف پہنچاتی تھی، اور انہوں نے ایسا ہی اس وقت بھی کیا جب انہوں نے ان راویوں کی تصدیق کر دی جب انہوں نے کوئی ایسی بات روایت کی جو انہیں بھلی لگی اور جس نے انہیں خوش کیا۔ کیونکہ جن لوگوں نے مال و دولت، ثروت اور اقتدار کی خبریں روایت کی ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے یہودی عبداللہ بن سبا کی خبریں اور مصر کے وفد کو قتل کرنے کا حکم دینے والے خط کی خبریں بھی روایت کی ہیں۔ تو پھر انہوں نے کس بنیاد پر ایک چیز کو بغیر کسی دلیل کے لے لیا، اور دوسری چیز کی بغیر کسی دلیل کے نفی کر دی؟ اصل اور واضح بات یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب نے — جیسا کہ انہوں نے خود کہا — یہ

چاہا کہ وہ صدرِ اسلام کے مسلمانوں کو اس سے کہیں بلند و برتر دکھائیں کہ صنعاء سے آنے والا ایک ایسا شخص ان کے دین، ان کی سیاست، ان کی عقلوں اور ان کی حکومت کے ساتھ کھلواڑ کر جائے جس کا باپ یہودی تھا، ماں سیاہ فام تھی، اور وہ خود بھی یہودی تھا، پھر وہ نہ تو کسی شوق سے اور نہ ہی کسی خوف سے اسلام لایا، بلکہ محض مکر، سازش اور دھوکہ دہی کے لیے مسلمان ہوا تھا۔

مسلمانوں کو بلند و برتر دکھانا ایک اچھا مقصد اور ایک خوبصورت نیت ہے، لیکن حق اس سے کہیں زیادہ اچھا اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اور نہ تو ہمارے لیے یہ مناسب ہے اور نہ ہی ڈاکٹر طہ حسین کے لیے یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کی خاطر حق کے معاملے میں مغالطہ آرائی سے کام لیں جسے وہ خود، یا ہم اچھا اور خوبصورت سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ من مانی اور زبردستی (بالتحکم) سے نہیں لکھی جاتی، بلکہ تاریخ تو پہلے روایات سے، پھر استدلال سے لکھی جاتی ہے، اور پھر اس کے بعد مختلف کڑیوں کے درمیان پائے جانے والے خلا کو پُر کرنے میں علمی کوشش صرف کی جاتی ہے۔ اب میں ڈاکٹر طہ کے سامنے ایسے حقائق رکھوں گا جن میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور میرا یہ گمان نہیں ہے کہ وہ ان حقائق سے جاہل ہیں یا ان سے غافل ہیں۔ آیئے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ منورہ کی طرف لوٹتے ہیں؛ اس پاکیزہ شہر میں قبیلۂ ازد

بن غوث کے ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد آباد تھی: ان دونوں قبیلوں کی ماں قیلہ اور باپ حارثہ بن ثعلبہ تھا، اور یہ کوئی اور نہیں بلکہ اوس اور خزرج تھے۔ اور انہی کے درمیان یہودیوں کی وہ بڑی تعداد (الجلیل من الیھود) بھی رہا کرتی تھی جو جزیرۃ العرب یا مدینہ میں مقیم تھی۔ تو اس کا نتیجہ ایک ایسے معاملے کی صورت میں نکلا جس کی مثال بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان بھی نہیں ملتی؛ اور وہ تھی ان دو قبیلوں اوس و خزرج کے درمیان طویل عرصے تک چلنے والی جنگیں، حالانکہ انہیں ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ نے جنا تھا اور وہ دونوں ایک ہی شہر میں اکٹھے رہتے تھے۔ اور ان دونوں قبیلوں کے درمیان یہ لڑائی لگاتار آگ بھڑکاتی رہی یہاں تک کہ تاریخ کا مشہور یومِ بعاث آگیا، اور وہ واقعہ ایسا ہے جیسا کہ ابنِ سعد نے بیان کیا ہے: یہ ان جنگوں میں اوس اور خزرج کے درمیان ہونے والا آخری معرکہ تھا جو ان کے مابین لڑی گئی تھیں؛ اور یہ معرکہ اس وقت پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں موجود تھے اور اسلام کی دعوت دے رہے تھے، پھر اس واقعے کے چھ سال بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اور ان دو سگے بھائیوں، اوس اور خزرج کے درمیان اس عجیب و غریب دشمنی کا پروان چڑھنا، طویل زمانوں تک ان کا آپس میں یہ تلخ اور شدید ترین خوں ریز قتال کرنا، اور

یہودیوں کا ان کی جنگوں میں اس طرح حلیف بن کر شامل ہونا کہ ان کا ایک گروہ اوس کے ساتھ اور دوسرا خزرج کے ساتھ مل جائے، جبکہ ان دو سگے بھائی قبیلوں کے مابین ہونے والی اس لڑائی کی آنچ سے خود یہودیوں کو بہت ہی کم نقصان پہنچتا تھا، اور جب بھی کوئی سخت معاملہ درپیش ہوتا تو ان کا یہودیت کے نام پر ایک دوسرے کو پکارنا — جس کے نتیجے میں وہ ان عربوں کے خلاف یکجان اور ایک ہاتھ بن جاتے تھے — اس سب کا اس کے سوا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہے کہ یہ یہودی ہی تھے جنہوں نے ان دونوں کے درمیان جنگ اور دشمنی کی آگ بھڑکائے رکھی؛ تاکہ وہ اس سرزمین پر ایسے اموال، گڑھیاں (اطام) اور قلعے مستحکم کر لیں جو ان کے لیے سامانِ حرب اور قوت کا ذریعہ بنیں، اور وہ انہیں اس زمین کے اصل مالکین عربوں پر غالب کر دیں، اور عرب لوگوں کی توجہ کو کھیتی باڑی اور مال کی افزائش سے ہٹا دیں، تاکہ خود یہودی ہی زراعت، تجارت اور سود و حرام خوری کے ذریعے مال بڑھانے کے تنہا مالک بنے رہیں۔ اور یہودیوں کا یہی شیوہ ہر دور اور ہر زمانے میں رہا ہے، پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف ہجرت فرماتے ہیں، اس کے بعد کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کے مقام پر خزرج کے ایک گروہ سے ملاقات فرمائی تھی، چنانچہ اوس اور خزرج کا کوئی بھی

محلہ ایسا نہیں بچتا جس میں اسلام داخل نہ ہوا ہو اور اس کا غلبہ نہ ہوا ہو۔ پھر ایک دن بنو قینقاع کے یہودیوں میں سے ایک شخص شاس بن قیس کا گزر اوس اور خزرج کے چند لوگوں کے پاس سے ہوتا ہے، تو اسے ان کے مابین یہ الفت و محبت اور اسلام پر ان کی باہمی صلح دیکھ کر سخت غیظ و غضب اور حسد آتا ہے، اس شدید دشمنی کے بعد جو جاہلیت میں ان کے درمیان رہ چکی تھی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے: اس سرزمین پر بنو قیلہ — یعنی اوس اور خزرج — کے تمام اشراف اکٹھے ہو گئے ہیں! خدا کی قسم، اگر یہاں ان کے تمام اشراف یوں ہی متحد رہے، تو پھر اس شہر میں ہمارے رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ یہودیوں کے ایک نوجوان کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ جائے، اور ان کے سامنے یومِ بعاث اور اس سے پہلے کے واقعات کا تذکرہ چھیڑ دے، اور انہیں وہ اشعار سنائے جو وہ جنگوں کے دوران ایک دوسرے کے خلاف فخر و تعلی کے طور پر کہا کرتے تھے۔ وہ یہودی نوجوان ایسا ہی کرتا ہے، تو اچانک وہ جماعت جو اسلام پر متحد و متفق ہو چکی تھی، آپس میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر فخر جتانے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اوس اور خزرج کے دو آدمی اچھل کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہتا ہے: اگر تم چاہو تو ہم اس جنگ کی آگ کو ابھی دوبارہ اسی شباب پر لوٹا دیتے ہیں جیسا وہ پہلے تھی۔ اس پر

دونوں فریق سخت غصے میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم نے تمہارا یہ چیلنج قبول کیا! تمہارا ہمارا مقابلہ ظاہرہ نامی مخصوص جگہ پر ہوگا اور وہ ہتھیار ہتھیار پکارنے لگتے ہیں''۔ وہ سب اپنے متبادل مقام کی طرف نکل کھڑے ہوتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبر پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں سے مہاجرین کو ساتھ لے کر ان کی طرف نکلتے ہیں، یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچتے ہیں تو فرماتے ہیں: اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ سے ڈرو اللہ! اللہ! کیا تم میرے تمہارے درمیان موجود ہوتے ہوئے بھی جاہلیت کی پکار پکار رہے ہو؟ اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں اسلام کی ہدایت دی، تمہیں اس کے ذریعے عزت بخشی، تمہارے اندر سے جاہلیت کے معاملے کو کاٹ دیا، تمہیں اس کے ذریعے کفر سے نجات دی اور تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی[79]۔ چنانچہ انصار — ان کے اوس اور خزرج دونوں — جان جاتے ہیں کہ یہ شیطان کی طرف سے ایک ابھار تھا اور ان کے دشمن کی ایک چال تھی؛ پس وہ رونے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کے گلے مل جاتے ہیں، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[79] ابن هشام، أبو محمد عبد الملك، السيرة النبوية، حققها مصطفى السقا وآخرون،1996م، ط1، بيروت، ج2، ص150-151 .

ساتھ سمع و طاعت فرمانبرداری اختیار کرتے ہوئے واپس لوٹ آتے ہیں،اور اللہ ان سے اللہ کے دشمن،یعنی شاس بن قیس یہودی کی سازش کی آگ کو بجھا دیتاہے۔ پھر اللہ جل شانہٗ اس فتنے کے معاملے میں آیات نازل فرماتاہے اوران مسلمانوں سے مخاطب ہوتا ہے جن کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود موجود تھے اور ابھی آپ کی وفات نہیں ہوئی تھی:اے ایمان والو!اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کی بات مانو گے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کافر بنادیں گے۔اور تم کیسے کفر کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کے رسول موجود ہیں؟اور جو کوئی اللہ (کے دین) کو مضبوطی سے تھام لے،تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دی گئی[80]۔

اسی لیے،ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ — خواہ وہ اوس سے ہوں یا خزرج سے — کو اس بات سے بالاتر (یا بڑا) نہیں سمجھ سکتے کہ انہوں نے یہودیوں کے ایک گروہ کی بات مان لی تھی،یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ یہودی انہیں ان کے ایمان کے بعد دوبارہ کافر بنادیتے۔اور نہ ہی ہم انہیں اس

---

[80] سورة آل عمران، الآيتان: 101-102 .

خطا سے پاک و منزہ قرار دے سکتے ہیں، جبکہ حال یہ تھا کہ ان پر اللہ کی آیات تلاوت کی جارہی تھیں اور ان کے درمیان خود اس کے رسول موجود تھے؛ جیسا کہ ڈاکٹر طہ حسین نے سن 35 ہجری کے صدرِ اسلام کے لوگوں کو ہر قسم کی لغزش سے پاک و منزہ قرار دینا چاہا ہے، جبکہ اللہ نے اپنے نبی کو اپنے پاس بلا لیا تھا اور اس واقعے کو بیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا، اور نوجوانوں کی ایک ایسی نئی نسل پروان چڑھ چکی تھا جس کے بارے میں کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ سب کے سب اپنے ایمان پر بزرگ صحابہ کی طرح شدید حریص تھے۔ پھر اس کے بعد، ادیبِ (مرحوم) محمود شاکر اپنی اس بحث کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں: کیا عقلوں میں یہ بات آسکتی ہے کہ یہودی اور ان کے منافق ساتھی پورے دس سال تک، لگاتار، دن بہ دن اسلام، رسول اللہ، اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے خلاف سازشیں کرتے رہیں؛ لیکن جیسے ہی رسول اللہ سن 11 ہجری میں رفیقِ اعلیٰ سے جاملے، تو انہوں نے ہر قسم کی سازش سے اپنے ہاتھ کھینچ لیے؟! اور وہ اس کے بعد اسلامی تاریخ میں پیش آنے والے ہر واقعے سے بالکل بری الذمہ ہو گئے؟! یعنی وہ سن 11 ہجری میں ہونے والے فتنہءارتداد سے بھی بری ہو گئے، اور سن 23 ہجری میں حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بھی بری ہو گئے، اور سن 35 ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بھی بری ہو گئے ؟! [81]۔

اس تمام گزشتہ بحث سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبد اللہ بن سبا کے وجود کا انکار کرنے سے طہ حسین کا اصل ہدف یہ تھا کہ: وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے خونِ ناحق میں یہودیوں کی شرکت کی نفی کر دیں، جس طرح انہوں نے فتنے کے پورے معاملے کو محض عصبیت (قومی وقبیلاتی تعصب) کی طرف لوٹانے کی کوشش کی ہے [82]۔ ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اسلامی ریاست کی حدود کے اندر تضادات پیدا کرنے میں عصبیت کا اپنا ایک کردار تھا، اور اس کے نتیجے میں کچھ جزوی اختلافات بھی پیدا ہوئے تھے جن کا ختم ہو جانا ممکن تھا، اور یہ بھی ممکن تھا کہ ریاست کا ماحول فتنوں سے آلودہ ہوئے بغیر ان اختلافات کے ساتھ زندگی کا سفر یونہی جاری رہتا؛ اگر وہ مخفی انگلیاں (خفیہ ہاتھ) اپنا کام نہ کر رہی ہوتیں جنہوں نے ان تمام تضادات کو اکٹھا کرنے کا بیڑا اٹھایا، تاکہ ایک ایسا واحد طوفان تیار کیا جائے جس نے اسلامی

---

[81] بتصرف واختصار من بحث الأديب الراحل محمود مُحمَّد شاكر، مجلة الرسالة المصرية، السنة السادسة عشر، الأعداد: 761، 763، 765 .

[82] مجلة الرسالة، مرجع سابق، السنة 16، عدد 761، ص137.

ریاست کے افق پر چل کر اسے فتنوں میں ڈبو دیا۔ مجموعی طور پر، جلیل القدر استاذ محمود شاکر (مرحوم) نے گزشتہ ابحاث میں اس کتاب کے علمی کھوکھلے پنکو اوراس کے مصنف کے نفس میں چھپی خواہشات اور رجحانات کے واضح پن کو بالکل آشکار کر دیا ہے۔ اوران کی بحث اس بات پر ختم ہوتی ہے کہ ابنِ سبا کی شخصیت اوراس کے پیدا کردہ واقعات ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں، اور طه حسین جب اس کی خبر کی نفی کرتے ہیں تو وہ دراصل حد سے تجاوز کرتے ہیں اور ایک ایسے راستے پر چل نکلتے ہیں جو ان جیسے شخص کے شایانِ شان نہیں ہے۔

چوتھی بات: ڈاکٹر عبدالعزیز الہلابی کے شبہات:

کنگ سعود یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر، ڈاکٹر عبدالعزیز الہلابی نے عبد اللہ بن سبا کے بارے میں ایک تحقیقی مطالعہ لکھا جو کویت کی حولیات الآداب (علمی مجلے) میں شائع ہوا[83]؛ اس میں مؤلف نے — اپنے زعم کے مطابق — فتنۂ عثمان و علی رضی اللہ عنہما کے واقعات میں ابنِ سبا کے کردار

[83] حولية تصدر عن كلية آداب جامعة الكويت.

کے متعلق اخباری سیف بن عمر التمیمی کی روایات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس تحقیق کا اختتام اس نتیجے پر کیا ہے کہ یہ روایات متضاد ہیں اور ان کی صحت کی کوئی بنیاد نہیں ہے؛ اور انہوں نے اپنی اس تحقیق میں اس ابنِ سبا کی شخصیت کے وجود ہی کی نفی کر دی ہے، اور ان کی رائے میں ابنِ سبا محض ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے جسے تاریخ اور فرقوں کی کتابوں نے لکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر عبد العزیز الہلابی کہتے ہیں: قدیم اخباریوں اور مؤرخین کے درمیان سے صرف اخباری سیف بن عمر التمیمی ہی اپنی روایات میں اس عبد اللہ بن سبا کی شخصیت کو ذکر کرنے میں منفرد ہیں؛ اور وہ فتنے پر اکسانے، خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے، اور بصرہ میں معرکۂ جمل کی جنگ چھیڑنے میں اسے ایک بنیادی کردار کے طور پر پیش کرتے ہیں[84]۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: سیف بن عمر وہ واحد مأخذ نہیں ہیں جن کے ہاں عبد اللہ بن سبا کی خبریں منحصر ہوں، بلکہ ابنِ سبا کی خبروں کا تذکرہ ان

---

[84] الهلابي، عبد العزيز صالح، 1987م، عبد الله بن سبأ، حوليات كلية آداب جامعة الكويت، الحولية الثامنة، ص13.

روایات میں بھی آیا ہے جو متقدمین (قدیم) علماء اور سیف بن عمر کے علاوہ دوسرے راویوں سے منقول ہیں، جن کا ایک اچھا خاصا حصہ ہم گزشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر عبد العزیز الہلابی کہتے ہیں: قدیم مآخذ میں سے جتنے بھی میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں بلاذری کی روایت کے سوا، میں سیف بن عمر کے علاوہ عبداللہ بن سبا کا کوئی تذکرہ نہیں جانتا۔[85]

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: وہ قدیم مآخذ جن کا ڈاکٹر الہلابی نے مطالعہ کیا ہے، اگر وہ ابنِ سبا اور سبئیت کا تذکرہ کرنے سے خاموش رہے ہیں، تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ وہ کوئی خیالی یا افسانوی شخصیت ہے؛ کیونکہ ان مآخذ کا اسے ذکر نہ کرنا، اس کے انکار یا اس میں شک پیدا کرنے کی کوئی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیا ان مآخذ نے اسلامی تاریخ کے تمام تر واقعات کا احاطہ کر لیا ہے کہ ہم محض اس وجہ سے انکار یا شک کا موقف اختیار کر لیں کہ انہوں نے ابنِ سبا کے بارے میں کچھ ذکر نہیں کیا؟ اور کیا کسی تاریخی روایت کی صحت کے لیے

---

[85] المرجع السابق نفسه، ص16.

یہ شرط ہے کہ تاریخ کی تمام کتابیں اس کے ذکر پر متفق ہوں؟ پھر کیا ڈاکٹر الہلابی یہ بات بھول گئے کہ قدیم مآخذ کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے، اور وہ مفقود (ناپید) یا مفقود کے حکم میں ہو چکے ہیں؟ اور اسی وجہ سے، شبہات اور وہم و گمان سے باہر نکلنے کے لیے اصل معلوم اور محقق (ثابت شدہ) معاملے کی طرف رجوع کرنا چاہیے؛ کیونکہ وہمی چیز معلوم چیز کو ختم نہیں کر سکتی، اور نامعلوم چیز محقق شدہ چیز کے معارض نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ابنِ سبا اور اس کے گروہ کی شخصیت ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس پر بلاذری کے علاوہ بھی بہت سے قدیم مآخذ متفق ہیں۔

الف۔ ابنِ سبا اور سبئیت کا تذکرہ اعشیٰ ہمدان کی زبان سے اشعار میں آیا ہے، جن کی وفات سن 83 ہجری (702ء) میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اہل کوفہ میں سے مختار ثقفی اور اس کے مددگاروں کی ہجو کرتے ہوئے یہ کہا تھا:

میں تمہارے خلاف اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ تم سب کے سب سبئی ابنِ سبا کے پیروکار ہو۔

اور اے کفر کے سپاہیو! میں تمہاری حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں[86]۔

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کیا گیا: ابوالحسن حضرت علی کے شیعوں (پیروکاروں) میں سے کچھ لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دابۃالارض (قربِ قیامت زمین سے نکلنے والی نشانی) ہیں، اور وہ قیامت کے دن سے پہلے دوبارہ دنیا میں بھیجے جائیں گے۔ اس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انہوں نے جھوٹ بولا ہے! وہ لوگ ان کے شیعہ (حقیقی متبعین) نہیں ہیں، بلکہ وہ تو ان کے دشمن ہیں۔ اگر ہمیں اس بات کا علم ہوتا کہ وہ دنیا میں واپس آئیں گے تو ہم نہ تو ان کی میراث تقسیم کرتے اور نہ ہی ان کی ازواج کے دوسرے نکاح کرتے[87]۔

---

[86] أعشى همدان، ديوانه، تحقيق حسن عيسى أبو ياسين، الرياض، ص148، وأنظر أبو الشعر، هند، مرجع سابق، ص341 – 342.

[87] ابن سعد، مرجع سابق، ج4، ص39.

ج۔ ابو عاصم خشیش بن اصرم (المتوفی سن 253 ہجری/859ء) نے اپنی کتاب الاستقامہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ابنِ سبا کے ساتھیوں کے ایک گروہ کو آگ میں جلائے جانے کی خبر روایت کی ہے[88]۔

د۔ ابنِ قتیبہ (المتوفی سن 276 ہجری/889ء) کہتے ہیں: بے شک سبئیت، رافضہ کے غالی فرقوں میں سے ہے، اور یہ لوگ عبد اللہ بن سبا کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں[89]۔

ھ۔ ناشی اکبر (المتوفی سن 293 ہجری/905ء) نے ابنِ سبا اور اس کے گروہ کے بارے میں درج ذیل تفصیل بیان کی ہے: اور ان میں سے ایک فرقے کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت علی زندہ ہیں، وہ فوت نہیں ہوئے، اور وہ اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک کہ وہ اپنی لاٹھی سے عربوں کو ہانک نہ لیں؛ یہ لوگ

---

[88] ابن تيمية، أبو العباس تقي الدين أحمد بن عبد الحليم، منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة القدرية، تحقيق محمد رشاد سالم، مكتبة دار العروبة، مصر، ج1، ص17 وما بعدها.

[89] ابن قتيبة، المعارف، مرجع سابق، ص267.

سبئیہ ہیں جو عبد اللہ بن سبا کے ساتھی ہیں۔اور عبد اللہ بن سبا صنعا یمن کا ایک یہودی تھا جو مدائن میں آکر رہ گیا تھا[90]۔

پس یہ وہ قدیم اور مستند نصوصہیں جو اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ابنِ سبا کی شخصیت ایک حقیقی شخصیت ہے، اور اسی طرح اس کا گروہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر عبد العزیز الہلابی نے ان نثری اور شعری نصوص کو ذکر کرنے کے بعد، جن میں سبئیت کا تذکرہ وارد ہوا ہے، یہ کہا ہے: اور اسی بنیاد پر، گزشتہ نصوص سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں ہے کہ سبئیت سے مراد کوئی ایسا گروہ ہے جس کی کوئی خاص سیاسی شناخت ہو یا کوئی ایسا مذہب ہو جس کے عقائد متعین ہوں؛ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جب بھی اس کا اطلاق کسی قوم پر ہوتا ہے تو اس سے مقصود محض مذمت اور عیب جوئی (طعنہ زنی) ہوتا ہے[91]۔

---

[90] الناشئ الأكبر، مرجع سابق، ص22.

[91] الهلابي، مرجع سابق، ص48.

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: ہم اس سے پہلے ڈاکٹر مصطفی شیبی کے شبہات کو باطل کرنے کے ذیل میں اس قضیے پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں، اور ہم یہاں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ محقق ڈاکٹر الہلابی کا یہ نتیجہ مغالطے اور حقیقت کو چھپانے سے خالی نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ ایسی کثیر نصوص موجود ہیں جو واضح طور پر ابنِ سبا کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو اصل کے اعتبار سے یہودی اور پرورش کے لحاظ سے یمنی تھا؛ اور ان نصوص کو تاریخ، حدیث، اسماء الرجال، انساب، ادب اور لغت کی کتب نے ذکر کیا ہے، اور فرقوں اور مذاہب و مقالات کے علماء نے اس بات پر حتمی جزم (یقین) ظاہر کیا ہے، جن میں سے چند مآخذ یہ ہیں:

الف۔ قمی (المتوفی سن 301 ہجری/913ء) نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا وہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کھلم کھلا طعن و تشنیع کی اور ان سے بیزاری کا

اظہار کیا، اور یہ دعویٰ کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے[92]۔

ب۔ نوبختی (المتوفی سن 310 ہجری/922ء) نے ابنِ سبا کی خبروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ جب مدائن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی، تو اس خبر کو نقل کرنے والے نے ابنِ سبا کا یہ قول بیان کیا: تو نے جھوٹ بولا ہے! اگر تو ہمارے پاس ان کا دماغ ستر تھیلیوں میں بھی لے آئے، اور ان کے قتل پر ستر عادل گواہ بھی کھڑے کر دے، تب بھی ہم تیری تصدیق نہیں کریں گے؛ کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ نہ مرے ہیں اور نہ ہی قتل ہوئے ہیں، اور وہ اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک کہ زمین کے مالک نہ بن جائیں[93]۔

ج۔ ابنِ حبان (المتوفی سن 354 ہجری/965ء) کہتے ہیں: اور (محمد بن السائب) کلبی ـــ جو کہ ایک اخباری (راوی) تھے ـــ عبد اللہ بن سبا کے ساتھیوں میں سے ایک سبئی تھے؛ یہ ان لوگوں میں سے تھے جو کہتے ہیں: بے

---

[92] القمي، مرجع سابق، ص20.

[93] النوبختي، مرجع سابق، ص27.

شک حضرت علی فوت نہیں ہوئے، اور وہ قیامت قائم ہونے سے پہلے دنیا میں دوبارہ واپس آئیں گے، اور جب بھی وہ کوئی بادل دیکھتے تو کہتے کہ امیر المؤمنین اس کے اندر تشریف فرماہیں[94]۔

د۔ شیعہ کے بڑے محدث، ابنِ بابویہ القمی (المتوفی سن 381 ہجری/991ء) نے ابنِ سبا کا وہ موقف ذکر کیا ہے جس میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دعا کے دوران آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانے پر اعتراض کر رہا تھا[95]۔

ھ۔ خوارزمی (المتوفی سن 387 ہجری/997ء) کی کتاب مفتاح العلوم میں وارد ہوا ہے کہ: سبئیت، عبداللہ بن سبا کے ساتھی ہیں[96]۔

و۔ ابنِ ابی الحدید (المتوفی سن 655 ہجری/1257ء) نے شرح نہج البلاغہ میں ذکر کیا ہے، جس کی عبارت کے الفاظ یہ ہیں: چنانچہ جب امیر المؤمنین علیہ

---

[94] ابن حبان، المجروحين، مرجع سابق، ج2، ص253.

[95] ابن بابوي القامي، أبو جعفر مُحَمَّد بن علي، من لا يحضره الفقيه، تحقيق السيد حسن الموسوي – نشر دار الكتب الإسلامية، ط5، طهران، ج1، ص213.

[96] الخوارزمي، أبو عبد الله مُحَمَّد بن أحمد بن يوسف، 1342هـ، إدارة الطباعة المنيرية، مصر، ص22.

السلام شہید کر دیے گئے، تو ابنِ سبا نے اپنے نظریات کا کھلم کھلا اظہار کیا، اور اس کا ایک ایسا گروہ اور فرقہ بن گیا جو اسے (اپنے مقتدا کے طور پر) پہچانتا تھا اور اس کی پیروی کرتا تھا[97]۔

ز۔ سکسکی (المتوفی سن 683 ہجری/1339ء) نے ذکر کیا ہے کہ: بے شک ابنِ سبا اور اس کا گروہ وہ پہلے لوگ ہیں جنہوں نے موت کے بعد دنیا میں دوبارہ واپس آنے (عقیدہِ رجعت) کا قول اختیار کیا[98]۔ اسی طرح ادب، مقالات اور فرق و مذاہب کی کتب نے باقاعدہ نام لے کر مخصوص اشخاص کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ سبئیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے؛ جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ محض ذم (مذمت) اور عیب جوئی کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ ایک ایسے گمراہ اور گمراہ کن فرقے کا نام ہے جس کے اپنے پیروکار اور مخصوص عقائد

---

[97] ابن أبي الحديد، أبو حامد عبد الحميد بن هبة الله، تحقيق حسن تميم، 1963م، نشر مكتبة الحياة ببيروت، ج2، ص99.

[98] السكسكي، عباس بن منصور، البرهان في معرفة عقائد أهل الأديان، تحقيق خليل أحمد إبراهيم الحاج 1980م، ط1، دار التراث العربي، ص50.

تھے۔ چنانچہ ابنِ قتیبہ نے ذکر کیا ہے کہ: مغیرہ بن سعد بجلی — جو بنو بجیلہ کا آزاد کردہ غلام تھا — وہ سبئی (ابنِ سبا کے عقائد پر) تھا[99]۔

اسی طرح جابر بن یزید جعفی ہے، جسے ابنِ حبان نے سبئیوں کے شمار میں ذکر کیا ہے، چنانچہ انہوں نے کہا: جابر جعفی عبد اللہ بن سبا کے ساتھیوں میں سے ایک سبئی تھا اور وہ کہا کرتا تھا: بے شک حضرت علی دنیا میں دوبارہ واپس آئیں گے[100]۔ اور سفیان بن عیینہ سے روایت کیا گیا ہے کہ وہ— یعنی جابر— کہا کرتا تھا: حضرت علی دابۃ الارض ہیں[101]۔ ان سبئیوں میں سے ابو النصر محمد بن السائب کلبی کوفی بھی ہے، جس کے بارے میں ابنِ حبان نے کہا: کلبی، عبد اللہ بن سبا کے ساتھیوں میں سے ایک سبئی تھا[102]۔ اور حافظ ابنِ زریع بصری اس (کلبی) کے بارے میں کہتے ہیں: میں نے کلبی کو دیکھا کہ وہ اپنے سینے پر

---

[99] ابن قتيبة، عيون الأخبار، مرجع سابق، ج2، ص149.
[100] ابن حبان، المجروحين، مرجع سابق، ج1، ص208.
[101] الذهبي، ميزان الاعتدال، مرجع سابق، ج1، ص348.
[102] ابن حبان المجروحين، مرجع سابق، ج4، ص162.

ہاتھ مارتا تھا اور فخر سے کہتا تھا: میں سبئی ہوں، میں سبئی ہوں![103]۔ پس سبئیت کا لفظ محض مذمت اور عیب جوئی طعنہ زنی کے لیے نہیں ہے، جیسا کہ ڈاکٹر الہلابی نے دعویٰ کیا ہے، بلکہ یہ ایک ایسا گروہ ہے جس کا ایک متعین عقیدہ اور اپنے پیروکار تھے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز الہلابی کی یہ رائے ہے کہ سبئیوں کو آگ میں جلائے جانے کی خبر محض ایک من گھڑت اور خود ساختہ دعویٰ ہے[104]؛ کیونکہ یہ سزا نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں مروج تھی اور نہ ہی ان سے پہلے کے خلفائے راشدین کے دور میں۔ جبکہ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے— جنہوں نے جلانے کی اس خبر کی نفی کی ہے— یہ کہا ہے کہ یہ (واقعہ) تاریخ کی کسی مستند اور قابلِ اعتماد کتاب میں وارد ہی نہیں ہوا ہے[105]۔

---

[103] ابن حجر العسقلاني، احمد بن علي، تهذيب التهذيب، 1362هـ، ط1، مطبعة دائرة المعارف النظامية، الهند، ج9، ص179.

[104] الهلابي، مرجع سابق، ص22.

[105] الشبي، كامل مصطفى، مرجع سابق، ص91.

ڈاکٹر الہلابی کے اس اعتراض کا رد اس روایت کے ذریعے ممکن ہے جسے امام بخاری نے عکرمہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ زندیق لائے گئے تو انہوں نے انہیں آگ میں جلوا دیا۔ جب یہ خبر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا: اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو انہیں نہ جلاتا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ کے عذاب سے منع فرمایا ہے؛ بلکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق انہیں قتل کر دیتا کہ: جو شخص اپنا دین بدل لے (مرتد ہو جائے)، اسے قتل کر دو[106]۔

شارحینِ حدیث نے زندقہ کی مختلف تفاسیر کی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ: اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو کفر کو چھپائے اور اسلام کا اظہار کرے۔ اور ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کا دعویٰ کرنا۔ جبکہ مسعودی کی یہ رائے ہے کہ فارسی وہ پہلے لوگ ہیں جنہوں نے زندیق کی اصطلاح استعمال کی؛ وہ لوگ ہر اس شخص پر (زندی) کا اطلاق کرتے

---

[106] ابن حجر العسقلاني، أحمد بن علي، فتح الباري بشرح صحيح البخاري- تصحيح وتعليق الشيخ عبد العزيز بن باز، نشر إدارة البحوث العلمية والدعوة والإرشاد، الرياض 12ج، ص226-227.

تھے جو تنزیل (وحی کے ظاہری الفاظ) کو چھوڑ کر تاویل کی طرف مائل ہو جائے، اور یہ نسبت (ان کی کتاب) زند کی طرف تھی جو کہ تاویل پر مبنی تھی، پھر عربوں نے اس لفظ کو معرب کر کے (عربی رنگ میں ڈھال کر) زندیق بنا دیا[107]۔ یہ تمام معانی ایسے ہیں جن کا قول سبئیت نے اختیار کیا تھا، اسی لیے امام ذہبی نے فرمایا: عبداللہ بن سبا غالی (انتہا پسند) زندیقوں میں سے تھا، جو خود بھی گمراہ تھا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا تھا[108]۔ اور حافظ ابنِ حجر نے فرمایا: عبد اللہ بن سبا غالی زندیقوں میں سے تھا، اور اس کے کچھ پیروکار ہیں جنہیں سبئیہ کہا جاتا ہے، وہ علی بن ابی طالب کے بارے میں الوہیت (خدا ہونے) کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور حضرت علی نے اپنی خلافت کے دوران انہیں آگ میں جلوا دیا تھا[109]۔ اور امام ابنِ تیمیہ نے فرمایا: بے شک رفض کی بنیاد

---

[107] ابن كمال باشا، رسالة في تحقيق لفظ زنديق، تحقيق حسين علي محفوظ، بغداد.

[108] الذهبي، ميزان الاعتدال، مرجع سابق، ج2، ص462.

[109] ابن حجر العسقلاني، لسان الميزان، مرجع سابق، ج3، ص289-290، وانظر كتاب الهداية الكبرى للخصيبي من أئمة النصيرية ص227، إذ قال بعد ذكر بعض معجزات علي– كرم الله وجهه– (وفي ذكر اليوم كانت فتنة عبد الله بن سبأ وأصحابه العشرة الذين كانوا معه، وقالوا ما قالوا، وأحرقهم أمير المؤمنين عليه السلام– بالنار، بعد أن استتابهم ثلاثة أيام، فأبوا ولم يرجعوا فأحرقهم في حفرة الأخدود، فكان هذا من

زندیق عبداللہ بن سباہی کی طرف سے رکھی گئی تھی[110]۔ پھر یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سبئی زندیقوں کے ایک گروہ کو آگ میں جلانے کا واقعہ، صحاح، سنن اور معاجم کی کتب میں موجود صحیح روایات کے ذریعے بالکل آشکار (ثابت) ہوتا ہے۔ چنانچہ جلانے کے اس واقعے کو امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں: کتاب الحدود— باب الحکم فی من ارتد (مرتد کے حکم کا بیان) —کے

دلائلہ—علیہ السلام-) والکتاب ملحق بکتاب: (العلویون بن الأسطورة والحقیقة) ھاشم عثمان، ط مؤسسة الاعلمي، بیروت.

اس سلسلے میں نصیری فرقے کے ائمہ میں سے خصیبی کی کتاب الہِدَایۃ الکُبریٰ (صفحہ 227) دیکھیے، کیونکہ انہوں نے حضرت علی۔ کرم اللہ وجہہ۔ کے کچھ معجزات کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا ہے: اور اسی دن کے ذکر میں عبداللہ بن سبا اور اس کے ان دس ساتھیوں کا فتنہ رونما ہوا جو اس کے ساتھ تھے، انہوں نے جو غلو کا قول کہنا تھا وہ کہا، اور امیر المؤمنین۔ علیہ السلام۔ نے انہیں تین دن تک توبہ کی مہلت دینے کے بعد آگ میں جلوا دیا۔ انہوں نے توبہ کرنے سے انکار کیا اور اپنے عقیدے سے رجوع نہ کیا، تو آپ نے انہیں خندق کے گڑھے میں جلوا دیا؛ چنانچہ یہ واقعہ بھی آپ۔ علیہ السلام۔ کے دلائلِ امامت و معجزات میں سے ایک دلیل تھا۔ اور یہ کتاب (ایک دوسرے مصنف کی) کتاب: العلویون بین الاسطورة والحقیقة(مصنف: ہاشم عثمان، مطبوعہ: مؤسسة الاعلمی، بیروت) کے ساتھ ضمیمے کے طور پر منسلک ہے۔

[110] ابن تيمية، مجموع الفتاوى – أبو العباس أحمد بن عبد الحليم، جمع وترتيب عبد الحمن بن مُحَمَّد بن قاسم الحنبلي، ط الرياض 1383هـ، ج 28، ص483.

تحت روایت کیا ہے[111]، اور امام نسائی نے اپنی سنن میں: کتاب الحدود کے تحت[112]، اور امام حاکم نے المستدرک میں — کتاب معرفۃ الصحابہ کے تحت— (اسے نقل کیا ہے)[113]۔اور امام طبرانی نے المعجم الاوسط میں سوید بن غفلہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ کچھ لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے ہیں، تو انہوں نے ان کی طرف آدمی بھیجا اور انہیں کھانا کھلایا، پھر انہیں اسلام کی طرف دعوت دی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا، پھر انہیں لایا گیا تو انہوں نے ان کی گردنیں اڑائیں اور انہیں اس گڑھے میں ڈال دیا، پھر ان پر لکڑیاں ڈال کر انہیں آگ لگادی، اور پھر فرمایا: اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا[114]۔عبد اللہ بن زید عامری کے طریق سے ان کے والد سے روایت کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ یہاں مسجد کے دروازے پر کچھ

---

[111] السجستاني أبو داود، سليمان بن الاشعث، تحقيق أحمد مُحَمَّد شاكر وزميله، دار المعرفة، بيروت، ج4، ص126.

[112] النسائي: أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب، السنن المجتبى، المكتبة التجارية الكبرى، مصر، ج7، ص104.

[113] الحاكم النيسابوري، مُحَمَّد بن عبد الله ، المستدرك على الصحيحين، 1389هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، ج3، ص583.

[114] ابن حجر العسقلاني فتح الباري، مرجع سابق، ج12، ص170.

لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ آپ ان کے رب ہیں۔ چنانچہ انہوں نے انہیں بلایا اور ان سے فرمایا: تمہاری خرابی ہو! تم کیا کہہ رہے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ ہی ہمارے رب، ہمارے خالق اور ہمیں رزق دینے والے ہیں۔ (یہاں تک کہ روایت کے الفاظ یہ کہتے ہیں کہ): حضرت علی نے فرمایا: گڑھا کھودو اور اسے زمین میں گہرا کرو، اور وہ لکڑیاں لے کر آئے اور انہیں اس خندق/گڑھے میں آگ کے اندر ڈال دیا۔ اور فرمایا: میں تمہیں اس میں پھینکنے والا ہوں یا پھر تم اپنے اس قول سے رجوع کر لو؛ لیکن انہوں نے رجوع کرنے سے انکار کر دیا، تو انہوں نے انہیں اس میں ڈال دیا، یہاں تک کہ جب وہ جل گئے تو انہوں نے فرمایا:

جب میں نے اس معاملے کو انتہائی قبیح اور منکر دیکھا
تو میں نے اپنی آگ کو خوب بھڑکایا اور قنبر کو پکارا!

حافظ ابنِ حجر نے فرمایا ہے: یہ سند حسن ہے[115]۔ ابو حفص بن شاہین (المتوفی سن 358 ہجری/995ء) نے اپنی سند سے امام شعبی (المتوفی سن 104

[115] ابن حجر العسقلاني فتح الباري، مرجع سابق، ج12، ص170.

ہجری/722ء) سے روایت کیا ہے—اور شعبی وہ شخصیت ہیں جن کے بارے میں امام ابنِ تیمیہ فرماتے ہیں کہ: وہ کوفی تھے اور شیعہ کے احوال سے سب سے زیادہ باخبر لوگوں میں سے تھے —کہ: بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غالی شیعوں کی ایک جماعت کو آگ میں جلوا دیا تھا اور ان میں سے بعض کو جلاوطن کر دیا تھا[116]۔اسی طرح ابو عاصم خشیش بن اصرم (المتوفی سن 254 ہجری/868ء) نے اپنی کتاب الاستقامہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ابنِ سبا کے ساتھیوں کی ایک جماعت کو جلائے جانے کی خبر روایت کی ہے[117]۔اور خشیش بن اصرم، امام ابو داؤد (المتوفی سن 275 ہجری /888ء) کے شیوخ میں سے ہیں اور روایتِ حدیث میں ثقہ (قابلِ اعتماد) ہیں؛ چنانچہ جلانے کا یہ واقعہ کثیر مراجع و مآخذ میں ثابت ہے، اور خاص طور پر صحیح بخاری میں اس کی اصل موجود ہے۔

---

[116] ابن تيمية، منهاج السنة، مرجع سابق، ج1، ص17.

[117] ابن تيمية، منهاج السنة، مرجع سابق، ج1، ص17.

تحقیق کا خاتمہ

ان تمام اقوال اور روایات کے نتیجے میں، جنہیں میں نے اس بحث میں پیش کیا ہے، میں یہ طے کرتا ہوں کہ ابنِ سبا کی شخصیت ایک ایسی تاریخی شخصیت ہے جس کا حقیقی وجود تھا، اور اس نے صدرِ اسلام میں رونما ہونے والے فتنوں کے واقعات میں ایک بنیادی کردار ادا کیا تھا— جس پر میں ایک مستقل تحقیق میں تفصیلی روشنی ڈالوں گا— اور بے شک جن لوگوں نے— جیسے ڈاکٹر الہلابی اور ان سے پہلے کے لوگ —ابنِ سبا کے وجود کی نفی کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے اپنے ان نظریات کی تائید میں کوئی ایک بھی قدیم اور بنیادی دلیل پیش نہیں کی جو اس کے وجود کی نفی کرتی ہو، اور تاریخی حقائق پر شک کرنے اور ان کا انکار کرنے میں ان کا اصل مقصد یہ دعویٰ کرنا ہے کہ اسلام کے اس سب سے زیادہ درخشاں دور میں جو فتنے رونما ہوئے، وہ محض صحابہ اور مسلمانوں ہی کا کام تھے، اور ابنِ سبا اور اس کے پیروکاروں کا ان فتنوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ حالانکہ میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ ان کے یہ تمام نظریات محض مفروضوں پر مبنی ہیں، اور علمی دلائل کے ساتھ ساتھ ان مراجع و مآخذ کی تائید سے بھی بالکل محروم ہیں جو متقدم ہیں اور ان واقعات کے زمانے سے قریب ترین ہیں۔

ناشر:
مسلم ورلڈ ڈیٹاپروسیسنگ پاکستان